ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

Monthly Hyderabad

SADA E SHIBLI

مارچ 2023 Mar جلد: 6 :Vol شمارہ: Issue:61

مدیر:

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران:

ڈاکٹر عبدالقدوس

ڈاکٹر سراج احمد انصاری

ابو ہریرہ یوسفی

قیمت فی شمارہ:	20/-
سالانہ:	220/-
رجسٹرڈ ڈاک:	350/-
بیرونی ممالک:	50/-امریکی ڈالر
خصوصی تعاون:	2000/-

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری
پروفیسر محسن عثمانی ندوی۔ پروفیسر ابوالکلام
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
مفتی محمد فاروق قاسمی۔ مولانا ارشاد الحق مدنی
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی
اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ۔ محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق۔ ڈاکٹر حمران احمد۔ ڈاکٹر ناظم علی
ڈاکٹر مختار احمد فردین۔ ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سید امام حبیب قادری۔ ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی
ڈاکٹر سمیہ تمکین۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی
ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
ڈاکٹر آصف لئیق ندوی۔ ڈاکٹر مظفر علی ساجد۔
مولانا عبدالوحید ندوی۔ مولانا احمد نور عینی
ابو ہریرہ ایوبی۔ محسن خان

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352,
B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Dabirpura Road, Purani Haveli,
Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	انسان کی جہالت اور عجز وفقر کا جائزہ	مولوی حبیب الرحمٰن	۷
۴	میرے بچپن کا رمضان اور عید	ڈاکٹر محمد نصیر الدین منشاوی	۹
۵	خواتین کا عالمی دن اور مصری خاتون	ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی	۱۸
۶	آمدِ رمضان	فضیل فوز	۲۱
۷	+60 لوگ۔ایک بوجھ یا رحمت؟	ڈاکٹر علیم خان فلکی	۲۲
۸	نظام حیدرآباد کرنل امیر الدین اور خلافت عثمانیہ کے مخفی دستاویزات	ڈاکٹر سید حبیب امام قادری	۲۶
۹	نظم	جہانگیر قیاس	۳۱
۱۰	پیغام آفاقی کا ناول ''دوست'' اور مسئلہ طلاق	شیخ شہباز	۳۲
۱۱	**غزل**	ڈاکٹر نادر المسدوسی	۳۵
۱۲	**غزل**	فہیم خیر محمد یٰسین ہابیل	۳۵
۱۳	مولانا ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی کی دو کتابیں	مبصر: اسامہ ارشاد معروفی قاسمی	۳۶
۱۴	ریوتاژ	:ڈاکٹر محمد آصف علی	۳۸
۱۵	خبر	ادارہ	۴۰

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب ابوسفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی

جناب محمد یوسف بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد

مفتی محمد فاروق قاسمی، صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش

ڈاکٹر سید جلیل حسین ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد

مولانا منصور احمد قاسمی، معین آباد، تلنگانہ

الحاج رئیس احمد اقبال، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد

الحاج محمد زکریا انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ)

ڈاکٹر شہباز احمد، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد

مولانا محمد عبدالقادر سعود، نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد

الحاج محمد قمر الدین، نیبل کالونی بارکس حیدرآباد

الحاج محمد عبدالکریم، صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

اپنی بات

گزشتہ ماہ فروری شام اور ترکی میں قیامت خیز زلزلے آئے۔ جس نے پوری دنیا کو متحیر کردیا۔ چند لمحے میں ہزاروں افراد لقمۂ اجل ہوگئے، فلک بوس عمارتیں ملبے میں تبدیل ہوگئیں۔ کروڑوں کی املاک آن کی آن میں تباہ و برباد ہوگئیں۔ میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعہ دل دہلانے والی تصاویر بڑی سرعت سے وائرل ہورہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے آمین۔

زلزلے کا پس منظر مذہبی نکتہ نگاہ سے اللہ کی آزمائش یا عذاب الٰہی ہے۔ جدید ٹکنالوجی اور سائنس کا الگ نظریہ ہے۔ کئی طرح کی آرائیں آرہی ہیں، لیکن اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ اس میں انسانوں کے اعمال یا شرارت کا ہاتھ ہے۔ پوری دنیا کے انسانوں کو غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم اتنی ٹکنالوجی کے ترقی کے باوجود ان جیسے حادثات کے رونما ہونے کے وقت بے بس ہوجاتے ہیں۔ ایسے مشکل حالات میں دنیا کے انسانوں اور ملت اسلامیہ پر فرض بنتا ہے کہ متاثرین کی دامے درمے سخنے مدد فرمائیں۔ الحمدللہ مدد کا سلسلہ جاری ہے اللہ تعالیٰ تمام معاونین کو بہترین بدلہ دے اور متاثرین کو صبر جمیل اور عافیت دے آمین۔

جب یہ ہمارا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو ہجری کیلنڈر کا نواں مہینہ رمضان المبارک شروع ہو چکا ہوگا، رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل کیا۔ پوری دنیا کے مساجد میں تراویح کا اہتمام ہوتا ہے، جوق در جوق قرآن مجید سننے کے لیے لوگ حاضر ہوتے ہیں اور مسجدیں بارونق ہوجاتی ہیں اے کاش ہم قرآن مجید کے سننے کے ساتھ ساتھ تعلیم، تفہیم اور تعمیل پر آجاتے تو کس قدر ہمارا فائدہ ہوتا۔ ماہِ رمضان کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا مغفرت، اور تیسرا نجات عن النار ہے۔ فرض کا ثواب ستر فرض اور نفل کا ثواب فرضوں کے برابر ہوجاتا ہے، اس ماہ مقدس میں سرکش شیاطین قید کردیئے جاتے ہیں اور رزق میں وسعت ہوجاتی ہے۔ یہ غمخواری کا مہینہ ہے اس میں غریبوں، پڑوسیوں اور عزیز واقارب کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔ اس ماہ مقدس میں فرائض کے ساتھ فضائل پر خوب عمل پیرا ہونا چاہئے تاکہ ہم اس موسم بہار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے بن جائیں۔ سحری اور افطار کے وقت دعاؤں کے ساتھ غریبوں کا خاص خیال رکھیں اگر ممکن ہو تو اعتکاف کریں، اسی ماہ میں شب قدر ہے جو ہزار مہینوں کے برابر ہے، علامہ ابن القیمؒ روزہ کے اسرار ومقاصد پر لکھتے ہیں کہ ”روزہ جوارح ظاہری اور قوائے باطنی کی حفاظت میں بڑی تاثیر رکھتا ہے، فاسد مادہ کے جمع ہوجانے سے انسان میں جو خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں اس سے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے، جو چیز مانع صحت ہیں ان کو خارج کردیتا ہے اور اعضاء وجوارح میں جو خرابیاں ہوا وہوس کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں وہ اس سے دفع ہوتی ہیں، وہ صحت کے لئے مفید اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے میں بہت مدد ومعاون ہے“۔ (صفحہ ۲۳۳)

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام مسجد الٰہی وادیٔ عمر شاہین نگر حیدرآباد میں تعمیری کام جاری ہے اس وجہ سے معاونین سے مؤدبانہ گزارش کی جاتی ہے کہ تعمیری کام میں نقد یا اشیاء کے ذریعہ حصہ لے کر ثواب دارین حاصل کریں۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

عکرمہ دشمنِ اسلام ابوجہل کے فرزند تھے اور اسلام سے پہلے باپ کی طرح آنحضرت ﷺ کے سخت ترین دشمن تھے، فتح مکہ کے وقت مکہ سے بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہوچکی تھیں، وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو تسکین دی اور ان کو مسلمان کیا اور خدمت اقدس میں لیکر حاضر ہوئیں، آنحضرت ﷺ نے جب ان کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے فوراً اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی، اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے: مرحبا بالراکب المهاجر اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا مبارک ہو۔

صفوان بن امیہ، قریش کے رؤسائے کفر میں سے اور اسلام کے شدید ترین دشمن تھے، ان ہی میں عمیر بن وہب کو انعام کے وعدہ پر آنحضرت ﷺ کے قتل پر مامور کیا تھا، جب مکہ فتح ہوا تو اسلام کے ڈر سے جدہ بھاگ گئے اور قصد کیا کہ سمندر کے راستے سے یمن چلے جائیں، عمیر بن وہب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! صفوان بن امیہ اپنے قبیلے کے رئیس ہیں، وہ ڈر سے بھاگ گئے ہیں کہ اپنے کو سمندر میں ڈال دیں، ارشاد ہوا کہ اس کو امان ہے، مکرر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! امان کی کوئی نشانی مرحمت فرمایئے، جس کو دیکھ کر ان کو میرا اعتبار آئے، آپ ﷺ نے عمامہ مبارک ان کو عنایت فرمایا، جس کو لیکر وہ صفوان کے پاس پہنچے، صفوان نے کہا مجھے وہاں جانے میں اپنی جان کا ڈر ہے، عمیر نے جواب دیا "صفوان! ابھی تمہیں محمد ﷺ کے حلم وعفو کا حال معلوم نہیں" یہ سن کر وہ عمیر کے ساتھ دربارِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ عمیر کہتے ہیں کہ تم نے مجھے امان دیا ہے، فرمایا "سچ ہے" صفوان نے کہا "تو مجھے دو مہینے کی مہلت دو" ارشاد ہوا کہ "دو نہیں تم کو چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔"

اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہوگئے، یہ واقعہ بہ تفصیل ابن ہشام میں مذکور ہے۔ ہبار بن الاسود وہ شخص تھا جس کے ہاتھ سے آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی زینبؓ کو سخت تکلیف پہنچی تھی، حضرت زینبؓ حاملہ تھیں اور مکہ سے مدینہ ہجرت کررہی تھیں، کفار نے مزاحمت کی، ہبار بن الاسود نے جان بوجھ کر ان کو اونٹ سے گرادیا، جس سے ان کو سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہوگیا، اس کے علاوہ بھی بعض جرائم کا مرتکب ہوا تھا، اور اسی بناء پر فتح مکہ کے وقت ہبار اشتہاریانِ قتل میں داخل تھا، چاہا کہ بھاگ کر ایران چلا جائے کہ داعی ہدایت نے خود آستانہ نبوت کی طرف جھکا دیا، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے حضور کے احسانات اور حلم وعفو یاد آئے، میری نسبت آپ ﷺ کو جو خبریں پہنچی تھیں وہ صحیح تھیں، مجھے اپنی جہالت اور قصور کا اعتراف ہے، اب اسلام سے مشرف ہونے آیا ہوں، دفعتاً بابِ رحمت وا تھا اور دوست دشمن کی تمیز یکسر مفقود تھی۔

(سیرۃ النبیؐ، جلد: دوم، ص: ۲۸۷-۲۸۸)

مولوی حبیب الرحمن۔حیدرآباد

انسان کی جہالت اور عجز وفقر کا جائزہ

انسان اگر اپنی حالت پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ خود اپنے لئے کوئی راہ متعین نہیں کرسکتا بلکہ ماحول اور نفس کی خواہشات اور لذّات کی طلب اس کو جس راہ پر ڈال دیتی ہے اسی راہ پر گامزن ہوجاتا ہے۔ ہر فانی قوت کے آگے اس طرح جھک جاتا ہے کہ اچھی عادتوں کو ترک کردیتا ہے۔ مشکلات و مصائب میں اس قدر مایوس' سراسیمہ و حیران ہوجاتا ہے کہ غیرت وخودداری سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا منکر اور اللہ تعالیٰ سے نا اُمید ہوجاتا ہے۔ اتنا محتاج و عاجز ہے کہ کسی سرپرست' معاون و رہبر کے بغیر بچپن و شباب کے منازل طئے نہیں کرسکتا اور زندگی کی کسی مشکل کو حل نہیں کرسکتا۔ آرام و اطمینان چاہتا ہے مگر فکر وآلام میں مبتلا رہتا ہے۔ امن و راحت چاہتا ہے مگر خوف وحزن دامن گیر رہتے ہیں۔ حزن وغم سے جتنا بھاگتا ہے اتنا ہی ان سے دوچار ہوتا ہے۔ فراغت وخوش حالی اگر نصیب ہوتی ہے تو اپنے ہی مقرر کردہ قوانین وفرائض کو ترک کردیتا ہے اور اپنے ذاتی اغراض کے مقابلہ میں دوسروں کے حقوق پامال کردیتا ہے۔ مدنی ومنزلی زندگی کے ضابطے بناتا ہے تو تمدن ومعاشرت کا اعتدال بگڑ جاتا ہے۔ اخلاق وکردار کی درستی کے آئین (قوانین) مقرر کرتا ہے تو بداعمالیوں میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اخلاقی پستی بڑھ جاتی ہے۔ حفظانِ صحت کے اصول بناتا ہے تو نئے نئے امراض پھوٹ پڑتے ہیں۔ صیانتِ حقوق کے لئے قوانین وضع کرتا ہے تو ظلم وحق تلفی بڑھ جاتی ہے۔ تعزیری احکام نافذ کرتا ہے تو جرائم میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ امن وسلامتی کے بین الاقوامی معاہدے مرتب کرتا ہے تو جنگ و جدال کی نت نئی صورتیں نکل آتی ہیں۔ غرض امن کی ہر کوشش سے جنگ' صلح کی ہر تجویز سے فساد رُونما ہوتا ہے۔ بناؤ سنوار کی ہر کوشش بگاڑ کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ راحت وآسائش کے لئے جو چیز ایجاد کی جاتی ہے وہ تباہی وبربادی کا سامان بن جاتی ہے۔ یہ محض خیالات نہیں، واقعات ہیں اور یہ واقعات اس حقیقت کو ظاہر کررہے ہیں کہ انسان اپنے حقیقی نفع وضرر کو متعین نہیں کرسکتا اور یہ کہ نفع حاصل کرنے اور ضرر سے بچنے کی تدابیر اور اپنی صلاح و فلاح کی تجاویز مرتب کرنے کی قابلیت انسان میں نہیں ہے۔ ان ہی معنی میں وہ اپنی زندگی کا مالک ومختار نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ وعظیم فرماں روا جو انسان اور تمام کائنات کا خالق ورب ہے وہی انسان کا مالک ومختار ہے۔ یہی اعلانِ حق ہے۔

"وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَایَشَآءُ ط وَیَخْتَارُ ط مَاکَانَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ ط" (القصص:68) ترجمہ: (اور آپ کا رب جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور مختار کل

ہے۔ان لوگوں کو تجویز (احکام) کا حق نہیں ہے (یعنی وہ تجویز احکام کی قابلیت نہیں رکھتے۔) اور یہ حقیقت بھی ثابت ہورہی ہے کہ انسان اپنے خالق کا محکوم ومملوک (بندہ) ہے اور اپنی صلاح وفلاح میں اپنے رب کے احکام وہدایات وعلم کا محتاج ہے جیسا کہ آیت ذیل سے ثابت ہے ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ج'' (الفاطر:15) ترجمہ: (اے لوگو تم سب اللہ ہی کے محتاج ہو۔)

انسان اس عالم میں کیوں پیدا کیا گیا؟ خالق اور دوسری مخلوق سے اس کا فطری تعلق کیا ہے ہر ایک کے حقوق وفرائض کیا ہیں؟ انجامِ حیات کیا ہے؟ یہ وہ مسائل ہیں جن سے انسان کو جہل ہی جہل ہے۔ جاہل' محتاجِ علم ہوتا ہے انسان کو پیدا کرنے والا جو انسان کی ہر حاجت پوری کررہا ہے۔ وہی علم کی احتیاج کو بھی پوری کرے گا۔ اس کے سواء انسان کو کوئی اور صحیح علم و ہدایت نہیں دے سکتا۔ اسی لئے خالق انسان نے ایک دستورِ رحمت نازل فرما کر انسان کو علم وہدایت کی روشنی بخشی اور وہ تمام احکام نازل فرمائے جو ایک غلام وبندہ کی صلاح وفلاح کے لئے ضروری ہیں اور اس طرح تمام انسانوں کو بندگیٔ رب کا حکم دیا۔ ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ'' (البقرہ:20) ترجمہ: (اے لوگو! اپنے رب کی بندگی کرو جو تمہارا بھی خالق ہے اور جو تم سے پہلے گزرے ہیں ان کا بھی خالق ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔) تاکہ انسان خالق ومخلوق دونوں کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہوجائے اور انسان کی زندگی فاسد عناصر سے پاک اور افراط وتفریط سے محفوظ رہے اور انسان اپنے فطری جذبۂ حکومت (اختیار) کا صحیح استعمال کر کے امن و سلامتی اور عدل و احسان کی دنیا آباد کرے اور نتیجتاً حیات بعد الموت کو بہتر سے بہتر بنالے۔ یعنی منزلِ مقصود کو پالے یہ تمام امور ''لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ'' کے مفہوم میں داخل ہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ''انسان اپنی صلاح وفلاح میں الٰہی تعلیم کا محتاج نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے کوئی ہدایت نامہ نازل نہیں فرمایا۔'' یہ محض جہالت کی باتیں ہیں ان لوگوں نے انسان اور خالقِ انسان کے فطری تعلق کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

ان حالات پر غور کرنے کے بعد یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ فطری طور پر انسان جس ربِّ اعلیٰ وعظیم کا محتاج ہے اسی سے برگشتہ (بھٹکا ہوا) ہے جس کی وجہ سے فتنہ وفساد اور خون خرابہ میں مبتلا ہے۔ حاکم ومحکوم اقوام دونوں کے دل ودماغ پر آج جو غیر فطری افکار و خیالات مسلّط ہیں دونوں میں جو انسانیت سوز اعمال پائے جاتے ہیں ادنیٰ ومتوسط طبقہ جن معاشی مشکلات میں مبتلا ہے اور سرمایہ داروں کے خلاف مزدور وغریب طبقہ جو بغاوت وجارحانہ اقدام پر آمادہ ہے یہ سب اپنے رب ومولیٰ سے احتیاج وغلامی کی نسبت منقطع کرنے کا نتیجہ اور اپنے رب ومولیٰ کی تعلیم سے روگرداں ہونے کا قدرتی ردّعمل ہے۔ فرد ہو کہ جماعت کسی کو سکون وچین نصیب نہیں۔ انسان' انسان سے خائف ہے اور اس عارضی زندگی کا یہ نقصان ابدی زندگی کے ابدی نقصان کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

حافظ قاری ڈاکٹر محمد نصیر الدین منشاوی۔استاذ شعبۂ اردو، آرٹس کالج، عثمانیہ یونیورسٹی۔حیدرآباد

میرے بچپن کا رمضان اور عید

یہ آج سے تقریباً سینتیس (۳۷) سال پرانی بات ہے جب میں دس سال کا تھا اور شہر حیدرآباد کے ایک قدیم اور باوقار محلّہ ملک پیٹ جو کہ میرا پیدائشی محلّہ ہے، مقیم تھا اور آج بھی وہیں ہوں۔اس وقت قدیم ملک پیٹ ''سلام صاحب کے دواخانہ'' سے مشہور اور ایک سمٹا ہوا محلّہ تھا جس کی حدود مغرب میں ملک پیٹ ریلوے اسٹیشن پر ختم ہوجاتی تھیں تو مشرق میں ریس کورس کی مغربی دیوار پر ختم ہوجاتی تھیں۔اس کے آگے پورے کھیت تھے اور آگے ہندوؤں کا شمشان شروع ہوجاتا تھا اور شمال میں اس کی حدود موسیٰ ندی پر ختم ہوتی تھیں۔جبکہ اس سے بہت پہلے ہی کھیتوں میں نئے نئے مکانات بننے شروع ہوگئے تھے جس میں مسجد ضیاء الحق کی تعمیر بھی شامل تھی اور پورے قدیم ملک پیٹ میں یہ چوتھی مسجد بن رہی تھی جبکہ اس سے پہلے مسجد قطب شاہی، مسجد عثمانیہ (پرنس باڈی گارڈ لائن) اور مسجد نور صرف یہ تین مساجد ہی موجود تھیں جبکہ آج سارے قدیم ملک پیٹ میں تیس سے زیادہ مساجد موجود ہیں۔جنوب میں محلّہ کی حدود محبوب منشن (جو کہ محبوب علی پاشاہ کی شکارگاہ تھی) اس کے وسیع وعریض میدان پر ختم ہوجاتی تھیں اور اسی میدان کے ایک کونے میں کنٹہ تھا اور اس سے متصل وہ بڑی شاہراہ تھی جو ملک پیٹ سے گزرتی ہوئی دلسکھ نگر، ایل بی نگر، حیات نگر ہوتے ہوئے وجے واڑہ کو جوڑتی تھی۔سڑکیں اور گلیاں وہی تھیں جیسی آج ہیں۔البتہ مکانات صحن والے تھے۔بڑے بڑے آنگن والے اور ہوادار۔ملک پیٹ ہی کیا سارے حیدرآباد کی سرزمین پر چار مینار سے اونچی کوئی عمارت نہ تھی جو آسمان کو منہ چڑا سکے۔حیدرآباد کے اکثر محلوں سے گزریں تو جگہ جگہ ہرے بھرے درخت نظر آتے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہمارے وجود کو مَس کرتیں۔اکثر ہم رکشوں میں سفر کرتے جن کے پردے لگے ہوتے تھے۔خواتین میں گوشے پردے کا یہ عالم تھا کہ اگر رکشے کو پردہ نہ ہوتا تو اسے واپس کردیا جاتا۔شام ہوتے ہی محلّہ پر اندھیرے کا راج ہوتا۔سڑکوں پر کہیں کہیں الکٹرک کے کھمبے ہوتے جن پر ساٹھ بتی کا گولا لائٹ کا لگا ہوتا یا کہیں کچھ اس سے بڑا۔ٹیوب لائٹ کا تو کوئی تصور نہ تھا الا ماشاء اللہ۔

نماز عشا کے ساتھ ہی گلیاں اور سڑکیں سنسان ہوجاتیں اور سکان محلّہ اپنے اپنے گھروں میں بند ہوجاتے۔راتوں کو تو شاید ہی گھر سے باہر کوئی نکلتا۔اس وقت محلّہ کے مکانات انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔لوگوں کے پاس پیسہ بہت کم تھا لیکن ان کے دل خلوص کے سمندر سے بھرے ہوئے تھے۔ہر ایک کے غم وخوشی کے موقع پر وہ ایسے ہوتے جیسے وہ پڑوس نہیں بلکہ رشتہ دار ہوں۔

میرا مکان پانی کی ٹانکی سے آگے ڈاکٹر سلام صاحب کے دواخانے سے متصل گزرنے والی سڑک کے نشیب میں حامد علی ایڈوکیٹ (جو کہ مشہور وکیل تھے اور ہم سے بچپن ہی سے محبت کرتے تھے اور تاحیات مسجد نور کے صدر رہے) کے گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی گلی میں واقع تھا۔گلی کے آغاز پر ایک سرکاری نل تھا جس سے سب گلی والے پانی لیتے کیونکہ ابھی اس گلی میں نل کے کنکشن نہیں دیئے گئے تھے۔نل اکثر رات کے وقت کھلتا تھا، کبھی کبھی دن میں بھی۔بہر حال رات ہو یا دن مقررہ وقت پر سب گلی والے مٹی کے گھڑوں اور تانبے کی بالٹیوں میں پانی بھرتے، ایک دوسرے کی مدد کرتے، کیا بچے کیا بڑے، کیا مرد کیا عورتیں، سب باری باری پانی لیتے اور وہیں مختلف عنوانات پر ڈھیر ساری باتیں ہوتیں۔

رمضان کا مہینہ

ایسے ہی خوبصورت اور محبت کے ماحول میں رمضان کا مبارک مہینہ آتا اور چلا جاتا لیکن جس رمضان کے مہینہ میں میں نے ہوش کے ساتھ پورے تیس روزے رکھے، وہ گرما کے مہینہ کا رمضان تھا۔رمضان کے مہینہ کی بہار تو شب معراج کے گزرنے کے ساتھ ہی محسوس ہونے لگتی اور شب برأت تو گویا رمضان المبارک کا باب الداخلہ ہوتی

کیونکہ اس کے گزرتے ہی گھروں میں صاف صفائی کا اہتمام ہوتا اور گھروں کو چونا پانی کرلیا جاتا۔ مساجد بھی رنگ و روغن سے مزیّن ہوجاتیں۔ اب بس چاندرات کا انتظار ہوتا۔ دو دن پہلے مسجد کے میناروں پر سائرن کس دیئے جاتے اور ان کو بجا کر دیکھ لیا جاتا انتیس شعبان کی مغرب کی نماز مسجد نور میں پڑھ کر ہم چھت پر چلے جاتے کہ چاند ماموں کا نظارہ کرسکیں اور اگر مطلع صاف ہوتا اور چاند نظر آجاتا اور مسجد سے سائرن بجادیا جاتا تو ہم سب بچے مارے خوشی کے چاند مبارک! رمضان مبارک کے نعرے لگاتے اپنے اپنے گھروں کو جاتے اور امی جان اور ابا جان کو سلام کرتے اور ان سے دُعائیں لیتے اور پھر تراویح کی تیاری شروع ہوجاتی۔

اگر انتیس (۲۹) کی شب چاند نظر نہیں آتا اور مطلع صاف نہ ہوتا تو سب لوگ کچھ دیر مسجد میں انتظار کرتے کہ کہیں سے کوئی خبر آئے۔ چونکہ اس وقت ٹیلیفون ہی کسی کسی کے پاس ہوتے تو سیل فون کا تصور ہی کیا؟ اب جن کے پاس ٹیلیفون ہوتے وہ رویت ہلال کمیٹی سے رابطہ کرتے اور اطلاع کرتے کہ چاند نظر نہیں آیا تو پھر تیس شعبان کی رات یکم رمضان قرار پاتی اور تراویح اسی رات سے شروع ہوتی۔

چار مسجدیں تھیں تو ہر مسجد میں سوا پارے کا اہتمام ہوتا۔ آج کی طرح جگہ جگہ پنج شبی شبینہ، سہ شبی شبینہ، یک شبی شبینہ کی بدعت کہیں نظر نہ آتی۔ تراویح کے اہتمام میں امی جان میرے لئے ابا جان اور چھوٹے بھائی کے لئے سفید ململ کے کرتے اور پائجامے سلوا کر تیار رکھتیں اور اذان عشاء کے ساتھ ہی ہم وہی کپڑے زیب تن کرکے نماز کیلئے جاتے۔ مسجد مصلیوں سے کھچا کھچ بھر جاتی۔ نمازیٔ بے نمازی سب نماز تراویح کیلئے نہا دھو کر حسبِ استطاعت اچھے کپڑے پہن کر مسجد آتے۔ سب کے چہروں پر خوشی کے آثار دیکھنے کو ملتے۔ سب ایک دوسرے کو رمضان کی مبارکباد دیتے اور نماز عشاء کے ساتھ ہی نماز تراویح میں مشغول ہوجاتے۔ نماز تراویح سے قبل مؤذن صاحب مصلیوں کو اس اعلان کے ساتھ آگاہ کردیتے "الصلاۃ سنۃ التراویح یرحکم اللہ" کے ساتھ تکبیر کہتے "وَلَا اِلٰہَ اِلَّااللّٰہ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اللّٰہُ اَکْبَر وَلِلّٰہِ الْحَمْد"۔ اور تمام مصلی کچھ آہستہ کچھ زور سے ان کی آواز میں آواز ملاتے اور پھر نماز تراویح شروع ہوجاتی۔ ہم سب بچے بھی آواز میں آواز ملاتے اور جب تراویح شروع ہوجاتی اور سب رکعت باندھ لیتے تو ہم تو بچے تھے، ابھی ہم پر نماز ہی فرض نہیں ہوئی تھی تو تراویح کا کیا سوال ہے؟ اِدھر امام صاحب نے عبادت شروع کی، اُدھر ہم شریروں نے شرارت کی نیت کرلی اور مسجد کے صحن میں موجود مولصری کے گھنے درخت پر چڑھ کر جھاڑ بندر کھیلنا شروع کردیا، جب تک امام صاحب سلام نہ پھیر دیتے۔ جو بچے تراویح کی اہمیت سے بالکل بیگانہ تھے، وہ امام صاحب کے "التحیات" میں بیٹھتے ہی جھاڑ سے اتر کر مسجد کے باہر بھاگ جاتے اور جن کے خون میں شرافت و شرارت کی آمیزش ہوتی، وہ آکر آخر صف میں انتہائی شرافت کے ساتھ نمازیوں میں شامل ہوجاتے اور ساری تراویح اسی طرح مکمل ہوتی۔ کبھی کبھی دو چار رکعت پڑھ بھی لیتے تاکہ مصلیوں کو شک نہ ہو کہ ہم بھی ان شریروں میں شامل ہیں۔ بالکل معصوم اور بھولی بھالی صورتیں بنائے ہر دو اور چار رکعت والی تسبیحات میں شامل ہوتے۔ کبھی کبھی کھیل کی دھن میں یہ دھیان نہ رہتا کہ امام صاحب نے سلام پھیر دیا ہے اور ہم جھاڑ پر ہی ہوتے اور ہمارا شور سن کر مؤذن صاحب یا کوئی مصلی ہم کو پکڑنے آتے تو ہم دھنا دھن جھاڑ سے کود کر رفو چکر ہوجاتے۔ اگر کوئی بچہ مؤذن صاحب یا کسی مصلی کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ غریب سب کی طرف سے فرض کفایہ کا فریضہ انجام دے کر آنسو پونچھتا ہوا جب مسجد سے باہر آتا تو سب بچے اس کی اس عظیم قربانی پر (یعنی مار کھانے پر) سلام پیش کرتے۔ وہ اور غصہ ہوکر مارنے کیلئے سب پر چڑھ دوڑتا اور سب اِدھر اُدھر گلیوں میں بھاگ جاتے اور وہ غریب روتا ہوا اپنے گھر کی راہ لیتا۔ ایسا ہر روز نہیں ہوتا مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا تھا۔

تراویح کے ختم پر وتر و نفل کے بعد صلوٰۃ پکارنے کا اہتمام ہوتا۔ صحن مسجد میں صلوٰۃ سے مراد یہاں نماز نہیں بلکہ مختلف انبیاء کرام کے نام کے ساتھ ان کے القاب کو بلند آواز سے پکارنا ہوتا ہے مثلاً الصلوٰۃ والسلام علیک یا حضرت سیدنا آدم صفی اللہ، نوح النجی اللہ، ابراہم خلیل اللہ، اسماعیل ذبیح اللہ، موسیٰ کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ اور آخر میں سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کا نام پکارا جاتا اور آپ کے نام کو سب ہم آواز ہوکر پکارتے اور پھر فاتحہ ہوتی۔ ہر بچہ یہ چاہتا کہ صلوٰۃ پکارے مگر صلوٰۃ پر ایک صاحب نگران ہوتے جو باری باری بچوں کو موقع دیتے اور چونکہ اللہ عزوجل نے اس فقیر کو بچپن ہی سے خوش آواز کی نعمت سے

نوازا ہے۔ جب ہم صلوٰۃ پکارتے تو سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے تو ہم کو تقریباً روز آنہ صلوٰۃ پکارنے کا موقع ملتا۔

ابا جان کا یہ معمول تھا اور زندگی کے اخیر لمحہ تک یہ معمول رہا کہ الحمد اللہ وہ مسجد سب سے پہلے جاتے اور سب سے آخر میں مسجد سے نکلتے تھے۔ اللہ عزوجل ان کی قبر کو نور سے بھر دے آمین۔ جب ہم صلوٰۃ پکارتے تو ابا جان بھی سنتے اور خوش ہوتے۔ اس وقت تو ہم معصوم تھے اور ہر چیز ثواب کی نیت سے کرتے تھے۔ ہم کو کیا پتہ تھا کہ کیا سنت ہے کیا بدعت؟ ہم سمجھتے تھے کے صلوٰۃ بھی رمضان کریم کی عبادت کا ایک حصہ ہے۔ ابا جان خوب سمجھتے تھے کہ یہ ایک مروجہ بدعت ہے۔ جو لوگوں نے گھڑ لی ہے' قربان جائیں ان کی دور اندیشی کے کبھی بھی انھوں نے ہم کو صلوٰۃ پکارنے سے نہیں روکا۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ یہ بچوں کا شوق ہے اور معصوم بچوں کو اس سے روکا جائے تو پھر ہزاروں سوال ان کے ذہنوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور یقیناً انہیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ ان کی تربیت بچوں میں سنت و بدعت کے فرق کو بہت جلد محسوس کر لے گی' چنانچہ یہی ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب لوگوں میں قرآن وسنت سے آگہی ہونے لگی اور لوگ سنت و بدعت کے فرق کو سمجھنے لگے تو ہم ہی کیا آہستہ آہستہ سب کے دلوں میں سنت سے محبت اور بدعت سے دوری ہونے لگی اور یوں یہ بدعت ختم ہوتی چلی گئی اور آج شاید ہی کسی کسی مسجد میں یہ رائج ہے۔ میں آج بھی اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے کہ بچپن میں ہم کن کن چیزوں کو عبادت سمجھ کر کیا کرتے تھے اور آج تک میں اس تحقیق میں ہوں کہ تراویح کے بعد ''صلوٰۃ علی الانبیاء کا موجد'' کون ہے؟ اللہ عزوجل ہم سب کو لمحہ اخیر تک اتباع قرآن وسنت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

نماز تراویح کے بعد محلوں میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ گھروں میں سحری کی تیاری ہوتی۔ بعض گھر چھوٹے چھوٹے ہوتے اور دیواریں ایک دوسرے سے بالکل ملی ہوئی تو پڑوس کی باتیں بھی کبھی کبھی صاف سنائی دیتی تھیں۔ سب گھروں میں سحری کی تیاری کی باتیں ہوتی۔ ہم چھوٹے تھے اور روزے تو ابھی فرض بھی نہیں ہوئے تھے لیکن ماحول کا اس قدر اثر ہوتا کہ ہم بھی امی جان اور ابا جان سے سحر کرنے کی ضد کرتے اور اسی خوشی میں ہم کو نیند کہاں سے آتی۔ نمازِ تراویح کے بعد ابا جان قرآن کریم کی تلاوت کرنے بیٹھ جاتے۔ امی جان سحری کی چیزیں تیار کر کے رکھنے لگ جاتیں اور ہم چھت کو تکتے رہتے اور ہمارے چھوٹے سے ذہن میں یہ خیالات بے چینی پیدا کر دیتے کہ اگر سحری میں ہماری نیند ہوشیار نہ ہوئی تو؟ نہ سحری کا مزہ لے سکیں گے اور نہ ہی روزہ رکھ سکیں گے۔ ہم ان ہی خیالات سے جنگ لڑتے رہتے۔ یہاں تک کہ ہم پر نیند کا نشہ چڑھنے لگتا تو بار بار امی ابا کو یاد دلاتے کہ ہمیں سحری میں اٹھائیں' جب ہم کو اطمینان ہو جاتا تو ہم سو جاتے۔

سحری میں ہماری آنکھ اس وقت کھلتی جب سحری والے بابا اپنا ''سحری باجہ'' بجاتے ہوئے چیخ چیخ کر کہتے ''سحری کرو اُٹھو'' اور اس کے ساتھ بہت سارے جملے وہ کہتے جو اس وقت ہمیں یاد نہیں۔ کبھی سائرن کی آواز ہمیں بیدار کر دیتی اور کبھی گہری نیند میں ہوتے تو امی ابا اُٹھا دیتے۔ بستر سے ہم اُٹھ کر بیٹھتے مگر جیسے ہی امی ابا پلٹے ہم پھر سو جاتے اور بار بار یہی ہوتا۔ وہ اٹھاتے اور ہم ''ابی اٹھ روں'' بول کے پھر سو جاتے بلکہ کبھی کبھی ہلکی پھلکی دھنکی بھی ہو جاتی تو ساز و آواز کی کرامت سے ہم ہیبت میں اُٹھ بیٹھتے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے پھر ڈانٹ پڑتی تو فوراً اُٹھ کر چلنے لگتے اور ضرورت سے فارغ ہو کر دونوں ہاتھ دھو لیتے اور پھر شروع ہوتی انگلی اور دانتوں کی لڑائی۔ سب کے بائیں ہاتھوں میں فاروقی منجن ہوتا اور شہادت کی انگلی برش (Brush) کا کام کرتی بلکہ بعض بعض گھرانوں میں کوئلہ منجن بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا اور ہمارے گھر میں چھوٹا سا آنگن تھا اور امی جان اسی آنگن میں ساٹھ بتی والے بلب کی روشنی میں دسترخوان دیتی تھیں۔ اس وقت سحری کے کھانوں میں دہی کا استعمال ضرور کیا جاتا تھا کہ روزے میں پیاس نہ لگے اور روزہ آسان ہو جائے۔ جب ہم کھا چکتے تو ابا جان اصراراً دو تین گلاس پانی پلا دیتے۔ اکثر تو میں امی جان اور ابا جان ہی روزہ رکھتے اور جب نانی ماں گھر آتیں تو ان کے ساتھ بھی سحری کے مزے ہوتے۔ کبھی کبھی میرے چھوٹے بھائی محمد ظہیر الدین بھی روزہ رکھتے اور سحری کرنے کی ضد کرتے اور سحر کر لیتے مگر دن چڑھتے ہی جب پیاس کی شدت ہوتی اور وہ بے چین ہو جاتے تو انہیں پانی پلوا دیا جاتا اور کہا جاتا کہ بچوں کیلئے کھانا پینا روزہ

ہوتا ہے اور اسی طرح دوسرے گھروں میں معصوم بچوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا۔ ابھی رات گہری ہی رہتی۔ سائرن کے ساتھ ہی ہم سحر ختم کر لیتے مگر بعض لوگ اذان تک کھانے کے قائل رہتے اور اذان تک کھاتے۔ سحر کے بعد نماز فجر کے بہانے ہم اندھیری گلیوں میں نکل کر کسی الّو کی طرح اپنے دوستوں کو تلاش کرتے، اگر کوئی مل جاتا تو اس کے ساتھ مسجد میں جا کر جھاڑ کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں منطقیں مارتے بیٹھ جاتے۔ اس طرح ہماری نماز فجر قضا ہونے سے بچ جاتی ورنہ اکثر بچے کیا بڑے بھی سحر کر کے سو جاتے تو پھر صبح ہی کی خبر لیتے اور ایک فرض پر دوسرے کو قربان کر دیتے۔ نماز فجر کے بعد اکثر ہم کرکٹ کھیلتے اور کچھ دیر بعد گھر جا کر سو جاتے اور طلوع شمس کے ساتھ ہی روزگار کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ آفس والے آفس جاتے' کاروبار والے کاروبار' اساتذہ اور طلباء مدرسہ اور اسکول جاتے نظر آتے مگر سب میں ایک چیز مشترک ہوتی۔ کیا چھوٹا کیا بڑا' رمضان کے احترام میں سب کے سر پر ٹوپی ہوتی جس سے سارا محلہ ایک نورانی منظر پیش کرتا۔ رمضان مبارک کی پہلی رات گزری کہ دن کا منظر بالکل بدل گیا۔ اب ہوٹلوں پر پردے نظر آنے لگے بلکہ بعض ہوٹلیں تو ظہر تک بند رہتیں۔ اسی ماحول کا حصہ ہوتے ہوئے جب ہم اسکول ادارۂ ملیہ جاتے تو وہاں کا ماحول بھی بڑا حسین ہوتا۔ سب بچوں کے سروں پر ٹوپی جو کہ وہاں کے یونیفارم کا حصہ تھی اور آنکھوں میں سرمہ ہوتا اور جس بچہ کے آنکھوں میں سرمہ ہوتا وہ روزہ دار سمجھا جاتا۔ اسکول میں سب ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔ رمضان مبارک! رمضان مبارک! اور سب دوست آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے کہ تم روزہ ہو۔ جو بچے روزہ رکھتے وہ تو بڑے زور و شور سے جواب دیتے ''الحمدللہ'' اور جو بچے سحری نہ کرتے' وہ صاف کہہ دیتے ''الحمدلبا'' اور جن بچوں کا روزہ اسکول آتے وقت کھل جاتا تھا' اگر چیکہ وہ سحری کئے ہوئے ہوتے تھے تو ان کا جواب مشکوک ہوتا اور وہ بچے ''الحمد'' کہہ کر خاموش ہو جاتے تو دوسرے ساتھی بار بار اصرار کرتے کہ کیا ''الحمدالحمد'' کہتے ہو یا کہو الحمدللہ یا کہو الحمدلبا۔ صاف صاف کہو تو وہ چڑ چڑا ہو کر کہتا ''بولا نا ''لبا'' بولکے۔ یعنی روزہ نہ رکھنے کا جواب تھا ''الحمدلبا''۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا یہ ''لبا'' کس زبان کا لفظ ہے اور اس کا موجد کون ہے؟ اس وقت بچہ بچہ روزہ رکھنے کا شوقین ہوتا اور روزہ رکھتا تو پوری امانت داری کے ساتھ۔ اگر چہ اسکول کا زمانہ تھا اور اسکول کی ٹانکیوں میں پینے کا پانی رکھا ہوتا اور دن گرم ہونے کے ساتھ روزہ دار بچوں کے حلق سوکھنے لگتے مگر مجال ہے کسی معصوم کی کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق سے نیچے اترے۔ یہ وہ جذبہ تھا جس نے آج تک ہم کو روزے کا مہتمم بنا رکھا ہے۔ اللہ عزوجل سے دُعا ہے کہ زندگی کا آخری روزہ بھی ہم سے نہ چھوٹے اور یہ سب رضائے الٰہی کیلئے ہو۔ آمین۔

گرما میں اسکول آدھے دن کا ہوتا اور ہم چھوٹنے کے بعد گھر واپس ہوتے ہوتے ظہر ہو جاتی اور پھر نمازِ ظہر کیلئے مسجد چلے جاتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ ہم نمازِ ظہر کے بعد مسجد ہی میں رُک جاتے اور مصلیوں کے مسجد سے جانے کا انتظار کرتے جب سب مصلی چلے جاتے تو اب ہم مسجد میں بستر لگا دیتے۔ مسجد کی بچھی ہوئی جائے نماز ہی بستر کا کام کرتی اور ایک اور جائے نماز جو کہ تہہ کی ہوئی ہوتی سرہانے تکیے کا کام کرتی۔ اس وقت گرمیاں شدت کی تھیں تو مسجد کے فرش کے ساتھ جائے نماز بھی گرم ہو جاتی۔ مسجد کی چھت پر Usha کمپنی کے پنکھے لگے ہوتے اور ان کی رفتار بھی کہیں آہستہ کہیں تیز ہوتی۔ ہم مسجد کی دیوار پر لگے سوئچ بورڈ Swicht Board پر اپنی قسمت آزماتے کہ کونسا پنکھا تیز چل رہا ہے اور پھر جب اپنی قسمت کھل جاتی تو اس تیز پنکھے کے نیچے لیٹ جاتے۔ اب اس پنکھے کی ہوا کونسی ٹھنڈی ہوتی؟ چھت گرم' بازو دیوار گرم' نیچے فرش گرم' ہوا گرم' اب ہم کو چاہیئے ٹھنڈک۔ اسوقت تو ایر کولر کا بھی کوئی تصور نہ تھا تو (اے سی) C/A کا نام بھی شاید ہم نے سنا ہوگا۔ اللہ عزول نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے جو ترقی کی ہے اور اپنے وجود کو فرحت بخش رکھنے اور دھوپ کی تمازت سے بچنے کیلئے جو طریقے ایجاد کئے ہیں' اس کی انتہا (اے سی) ایر کنڈیشنر ہے لیکن اس وقت ہمارے معصوم ذہنوں نے کس طرح ایر کنڈیشنر کی ایجاد کی تھی۔ اس کی تفصیل بھی ذرا سن لیجئے۔

مسجد میں نیم دائرے کا ایک حوض تھا اور حوض کا دہانہ کھلا تھا لیکن پرندوں کی بیٹ سے بچانے کیلئے اس پر بڑے بڑے تختے رکھے گئے تھے۔ ہم مسجد میں تہ کر کے رکھی ہوئی سفید چادر جس کو (چاندنی)

کہتے ہیں اس کو تختے ہٹا کر حوض میں ڈبوتے اور اچھی طرح ڈبوتے کہ ایک سوت کی جگہ بھی سوکھی نہ رہتی اور پھر اچھا نچوڑ کر اس پنکھے کے نیچے آتے جو تیز چل رہا ہو اور سر سے پیر تک اپنے وجود کو ڈھانک لیتے۔ چنانچہ پنکھے کی وہ گرم ہوا جب چادر سے چھن کر ہمارے وجود کو مَس کرتی تو اس میں ہم وہ قدرتی ٹھنڈک محسوس کرتے جو شاید اے سی میں بھی نہ ہو۔ کب ہم کو آنکھ لگ جاتی پتہ ہی نہ چلتا۔ عصر کی اذان سے پہلے مؤذن صاحب کے شور سے یا کبھی اذان کے ساتھ ہماری آنکھ کھلتی۔ اس طرح ہم قدرتی اے سی کے مزے لوٹتے اور روزہ ہمارا کسی قدر آسانی سے کٹ جاتا اور یہی عمل اگر مسجد میں نہ ہوتا تو گھر پر ہوتا۔

جیسے ہی نماز عصر ہوتی' گھروں میں افطار کی تیاریاں تیز ہو جاتیں۔ بازاروں میں گہما گہمی بڑھ جاتی۔ مستقل دوکانوں کے علاوہ کچھ رمضانی تاجر بھی سڑک پر مختلف پھلوں کی دُکانیں لگا لیتے۔ بازاروں میں خورد ونوش کی تمام اشیاء وہی ہوتیں جو ہم سال بھر کھاتے رہتے البتہ دو نعمتوں کا بازاروں میں اضافہ ہو جاتا اور وہ تھے کھجور اور دہی بڑے۔ کھجور تو وہی پینٹ کھجور ہوتے جو ہر دوکان اور ہر ٹھیلی پر نظر آتے۔ آج کی طرح کئی قسم کے کھجور کہاں دستیاب ہوتے۔ بس یہی پینٹ کھجور ہوتے اور چنے کی اُبلی ہوئی دال جو ہر غریب وامیر کی افطاری کا حصہ ہوتی۔ الا ماشاء اللہ۔ مشروبات میں لیمو کا شربت اور شربت روح افزاء ہوتا۔ اس وقت حلیم کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ اکثر عصر کی نماز کے بعد ہم بے حال ہو جاتے۔ پیاس شدت کی لگ رہی ہوتی اور ہم اندر باہر آتے اور ہر دو منٹ میں امی ابا سے وقت پوچھتے رہتے اور امی ابا کہتے کہ بیٹا اللہ کا ذکر کرو۔ افطار کے وقت دُعائیں قبول ہوتی ہیں تو ہاتھ میں تسبیح لئے گھر کے باہر بیٹھ جاتے اور سبحان اللہ، الحمد اللہ، اللہ اکبر پڑھنے لگتے اور گلی سے گزرنے والوں کو سلام کرتے۔ بدلے میں ہم کو ان کی مسکراہٹیں اور محبتیں ملتیں۔ امی جان کا یہ معمول تھا کہ وہ پکوان کے وقت یا افطار کی تیاری کے وقت ٹیپ ریکارڈ میں شیخ عبدالباسط عبدالصمد رحمتہ اللہ علیہ کی قرأت سنتیں یا شاہ بلیغ الدین رحمتہ اللہ علیہ کی رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ اور صحابہ کی سیرت پر مشتمل کیسیٹس سنتیں تھیں اور جانے انجانے میں سنی جانے والی یہ قراءتیں اور بیانات ہی کا نتیجہ ہے کہ آج یہ قلم اس قابل ہوا کہ ملت اسلامیہ کو کچھ دے سکے اور وہی قراءتوں کا نتیجہ ہے کہ آج اس حلق سے اللہ عزوجل اپنے کلام کی خدمت لے رہے ہیں۔ اللہ عزوجل میرے والدین کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین۔

معصوم روزہ دار بچے کا واقعہ

جیسے رمضان آتا، اسوقت ایک کیسٹ گھروں اور بازاروں میں بجائی جاتی جس میں اس روزہ دار بچے کا واقعہ ہوتا جس کو ترنم میں ریکارڈ کیا گیا تھا اور وہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ ہر سننے والے کی آنکھ نم ہو جاتی۔ اس قصہ کا لب لباب یہ تھا کہ کسی گاؤں میں ایک سات سال کا بچہ تھا اور جب رمضان کی پہلی رات تھی تو اس نے اپنی ماں سے کہا کہ امی سحری میں اٹھانا' میں روزہ رکھوں گا۔ مگر ماں نے اس کی کمسنی کی وجہ سے اسے سحر میں نہیں اٹھایا اور صبح ہوئی تو وہ بچہ رونے لگا تو ماں نے اسے سمجھایا کہ بیٹا روزہ بچوں پر فرض نہیں۔ وہ دن تو اس نے گزار لیا لیکن دوسری سحری میں اس نے سحری کی اور روزہ رکھ لیا۔ صبح ہوئی اور ماں نے جب اس کیلئے ناشتہ تیار کیا تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا اور نہ ہی پانی پیا۔ جیسے جیسے دن چڑھنے لگا، پیاس اور بھوک کی شدت سے اس کی طبعیت خراب ہونے لگی۔ ماں باپ نے اسے لاکھ سمجھایا کہ بیٹا تم روزہ توڑ دو اور ہم رب ذوالجلال کو جواب دے دیں گے لیکن روزہ کے شوق اور اجر کے ذوق میں اس نے ان کی سنی ان سنی کر دی۔ یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا اور اس معصوم کی طبیعت اور بگڑنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کا افطار کے قریب انتقال ہو گیا۔ ماں باپ پر قیامت ٹوٹ پڑی یہاں تک کہ مسجد سے اذان مغرب کی آواز آنے لگی۔ دونوں نے بوجھل دل سے روزہ افطار کیا اور نماز پڑھ کر دُعائیں کرنے لگے۔ یکا یک ان کے گھر پر دستک ہوئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا تو سامنے سائل یہ کہہ رہا تھا کہ میں روزہ دار ہوں اور مجھے افطار کرا دو۔ یہ سن کر گھر میں جو افطار رکھی ہوئی تھی' ساری کی ساری لا کر اس سائل کو دے دی۔ انہیں غمگین دیکھ کر سائل نے پوچھا آخر اس غم کا ماجرا کیا ہے؟ انھوں نے اس سائل کو اندر بلایا اور بچہ کی لاش دکھائی اور سارا ماجرا کہہ سنایا! سائل نے یہ سن کر بچہ کی زندگی کی اللہ عزوجل سے دُعا کی۔ چنانچہ دُعا قبول ہوئی اور بچہ زندہ ہو گیا۔ بچہ کے زندہ ہوتے ہی وہ سائل غائب ہو گیا۔ وہ سائل کوئی اور نہیں اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ تھا۔ یہ منظر دیکھ ماں باپ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے اپنے

لخت جگر کو سینے سے لگایا۔ یوں روزہ داروں کی دُعا کی مقبولیت اور روزہ کی فضیلت جہاں پر آشکارا ہوگئی۔ اس واقعہ کی سند کی ہم نے کبھی تحقیق تو نہیں کی بس سنتے آئے ہیں اب اس کی صحت کا تو اللہ ہی کو علم ہے۔

عصر کی اذان کے بعد مسجد میں یہ منظر ہوتا۔ مؤذن صاحب سامان کے کمرے سے مٹی، صحنکیں اور کلیا باہر نکالتے اور بچوں کو دھونے کیلئے دے دیتے۔ بچے بڑے شوق سے یہ ڈیوٹی انجام دیتے اور ہم بھی اکثر اس میں شریک ہوتے۔ افطار سے پہلے ہی سے مسجد کیلئے گھروں سے افطاری آنا شروع ہوجاتی۔ کہیں سے کھجور، موز کے ٹکڑوں کے ساتھ سیب کے ٹکڑے، دال، کہیں سے دہی بڑے وغیرہ وغیرہ اور پھر اس افطار کی تقسیم پر ایک نگران مقرر ہوتا اور وہ سب برتنوں میں افطار کی مناسب تقسیم کردیتا اور مؤذن صاحب کیلئے ایک بڑے کنڈے میں افطاری بھیجی جاتی۔ مغرب کا وقت شروع ہونے سے کچھ پہلے مسجد میں مصلیوں کیلئے ایک پلاسٹک کا لال دسترخوان بچھایا دیا جاتا اور افطاری رکھدی جاتی اور سائرن کے ساتھ ہی سب دُعا ختم کرکے روزہ کھول لیتے۔

بعد عصر ایک دوسرے کے گھر افطاری بھیجی جاتی، ہم اکثر مسجد میں افطار کرتے مگر گھر پر بننے والی اور تحفہ میں آنے والی افطار کی ایڈوانس بکنگ کردیتے کہ امی ہم تراویح کے بعد اس پر ہاتھ صاف کریں گے اور ادھر مسجد میں تراویح کے بعد اس افطاری کے کنڈے کو نمودار کیا جاتا جسے مؤذن کے گھر بھیج دیا گیا تھا اور اس افطار میں ان سب بچوں کا حصہ ہوتا جنھوں نے افطاری کی تیاری میں مدد کی تھی۔ اس طرح رمضان شریف آتے تو ہمارے مزے ہی مزے ہوتے۔ اب سارا رمضان یہی کچھ ہوتا رہتا۔

جمعته الودع

جمعۃ الوداع کا بھی خاص اہتمام ہوتا۔ مساجد بھر بھر کر مصلی سڑکوں پر آجاتے اور مکہ مسجد کا منظر تو دیکھنے کے لائق ہوتا۔ ابا جان مجھے ساتھ لے کر مکہ مسجد جاتے اور جمعۃ الوداع ہم یہیں ادا کرتے۔ اس وقت مصباح القراء حضرت عبداللہ قریشی الازہری رحمتہ اللہ علیہ جمعہ کے خطیب تھے اور امام بھی۔ کیا ان کا لہجہ، کیا ان کی عربی میں فصاحت و بلاغت۔ کیا ان کی آواز اور کیا خطبہ کا انداز۔ یہی وجہ تھی کہ جمعۃ الوداع اور عیدین کے موقع پر گلزار حوض تک صفیں بنتیں اور دوسری طرف موجودہ پستہ ہاؤز تک صفیں بنتی چلی جاتی تھیں۔ سامنے چار مینار دواخانہ کا صحن بھی بھر جاتا اور ہر طرف یوں محسوس ہوتا کہ سفید چادریں زمیں پر بچھادیں گئی ہوں۔ خطبہ کے دوران بڑی رقت کے ساتھ جب خطیب صاحب ''الوداع یا شہر رمضان'' کے الفاظ تکرار سے ادا کرتے تو لوگوں کی ہچکیاں بندھ جاتیں، آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے۔ لاکھوں کا مجمع ہوتا۔ دن چڑھے ہی مکہ مسجد کے چاروں طرف سواریوں کا آنا جانا بند کردیا جاتا اور کبھی مصری قراء آجاتے تو ان کی قرأت بھی سنادی جاتی نماز جمعہ سے پہلے۔

رمضان کے اخیر عشرے میں ستائیسویں شب یعنی شب قدر کی رات تراویح میں ختم قرآن ہوتا اور اس کی تیاری الگ سے ہوتی۔ امی جان خاص طور پر شب قدر کیلئے نئے کپڑے سلوا کر تیار رکھتیں اور ہم وہی زیب تن کرتے۔ شب قدر سے دو تین دن پہلے موذن صاحب ہم بچوں سے کہتے کہ کل مسجد دھونا ہے تو ہم سب دوسرے دن بعد نماز فجر تیار رہتے اور جب مصلی چلے جاتے تو کاروائی شروع ہوجاتی۔ مسجد کا فرش پالش کے پتھر کا تھا۔ اس پر پانی ڈالتے تو وہ چکنا ہوجاتا۔ ہم گھٹنوں تک پائجامہ چڑھائے اس پر پھسلنے لگتے گویا کہ وہ ہمارے لئے اسکیٹنگ لان ہو۔ مسجد کا فرش دھوتے دھوتے ہم بھی دھل جاتے۔ ایک دوسرے پر پانی ڈالتے۔ خوب ہلہ گلہ کرتے پھر نماز ظہر تک مسجد مفروش ہوکر نمازیوں کے لئے تیار ہوجاتی۔ شب قدر سے دو دن پہلے کئی کلو اجوائن، کالا نمک اور کھجور مسجد پہنچ جاتے اور پھر بعد نماز تراویح سب بچے بڑے مل کر ان کے پیکٹس بناتے تاکہ انہیں ختم قرآن کے دن تمام مصلیوں میں تقسیم کیا جاسکے اور اس کو ''تبرک'' کا نام دیا جاتا۔

شب قدر کی رات تراویح میں امام صاحب سورۃ الضحیٰ سے سورۃ الناس تک بیس رکعت مکمل کرلیتے۔ اس کے بعد جلسہ ہوتا جس میں اس وقت کے مشہور قاری شمس الدین اعجاز جو کہ ابا جان کے شاگرد تھے ان کے ساتھ کبھی کبھی ہماری بھی قرأت ہوجاتی۔ کوئی بیان وغیرہ نہ ہوتا البتہ حافظ صاحب، امام صاحب، مؤذن صاحب کی شال پوشی و گلپوشی ہوتی اور ان میں تحائف تقسیم کئے جاتے۔ مسجد میں مدرسہ بھی چلتا تھا اور تمام اساتذہ اپنی اپنی جماعت کے بچوں کو ترغیب دیتے

کہ رمضان میں جو زیادہ قرآن کے دور ختم کرے گا' انہیں انعام دیا جائے گا اور پھر ان میں اس جلسہ میں حسب مراتب انعامات تقسیم کئے جاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک طالبہ کو جس نے رمضان کے مہینہ میں سات قرآن مجید کے دور ختم کئے تھے اور اس نے انعام اول حاصل کیا تھا۔ کبھی کبھی مدرسہ کے بچوں کا عملی مظاہرہ بھی ہو جاتا۔ شب قدر کے گزرتے ہی ایسا معلوم ہوتا کہ گویا رمضان ہی رخصت ہو گیا ہو۔ نمازوں میں مصلیوں کی تعداد گھٹ جاتی' افطار میں روزہ داروں کی تعداد کم ہو جاتی اور تراویح میں بھی مسجدیں خالی خالی نظر آتیں۔ اب انتظار بڑی شدت سے کس کا ہوتا تو وہ شوال کے چاند کا کب نظر آئے اور کب عید ہو۔ اب ہر زبان پر یہی الفاظ ہوتے کہ چاند انتیس (29) کا ہوگا کہ تیس کا۔ اللہ اللہ کر کے ستائیس، اٹھائیس گزر جاتی اور انتیس کا دن بڑی کشمکش کا ہوتا کہ چاند نظر آتا یا نہیں؟ اگر چاند نظر آجاتا تو سب ایک دوسرے کو چاند مبارک، چاند مبارک کہتے۔ بچے نمازِ عشاء کا انتظار کرتے اور جیسے ہی نماز کے بعد مسجد خالی ہو جاتی تا بڑ توڑ مٹی کی صحنکوں اور کلیوں پر حملہ کرتے جو افطار کیلئے استعمال ہوتی تھیں اور ان برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سے ایک لذت محسوس کرتے گویا کہ عید کے استقبال میں پٹاخے چھوڑ رہے ہوں۔ مساجد کے میناروں سے عید کے سائرن بجنے کے ساتھ ہی بازاروں کی رونق اور بڑھ جاتی۔ مرغ کا گوشت' گائے کا گوشت' بکری کا گوشت' دودھ' دہی کی دوکانوں اور ترکاری کی دُوکانوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے اور چوڑیوں کی دوکانوں پر تو لڑکیوں اور خواتین کا سیلاب نظر آتا۔ آج کی طرح ہر محلہ میں ڈیری فارم تو تھے نہیں۔ اگر تھے بھی تو ان کا دودھ کہاں ہر شہری کو بس ہوتا، تو گورنمنٹ دودھ کے ٹینکروں کا انتظام کرتی جیسے پانی کے ٹینکر ہوتے ہیں اور ان ٹینکروں کو شہر کے مختلف مراکز میں ٹھیرایا جاتا۔ یہ دودھ نسبتاً دام میں سستا مگر اچھا ہوتا اور آدھی رات کے قریب یا رات کے اخیر حصہ میں ختم ہو جاتا اور جو لوگ دیر سے پہنچتے انہیں دودھ نہیں ملتا اور وہ لوگ کہیں اور کوشش کرتے۔ نہ ملتا تو اب کہاں ان کے گھر شیر خرمہ بنتا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم اس صحیفہ مسجد کے مرکز پر دودھ لینے کیلئے لمبی قطار میں کھڑے تھے۔ ایک صاحب آئے اور ابا جان کو قطار سے الگ کیا' میں بھی ساتھ ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کو دودھ دلوادوں گا۔ ان ہاتھ میں مائک تھا اور انھوں نے ابا جان کو کہا کہ آپ مائک میں صرف اتنا کہیں کہ یہاں اعظم پورہ مرکز پر جو دودھ فروخت ہو رہا ہے وہ بہت عمدہ اور سستا ہے جس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ آپ تمام لوگوں سے درخواست ہے کہ یہاں سے دودھ خریدیں۔ دوسرے دن اس وقت اس واقعہ کا عقدہ کھلا جب لوگوں نے کہا کہ آپ لوگ (یعنی میں ابا) سرکاری ٹی وی دور درشن پر نظر آئے تھے، تب پتہ چلا کہ دراصل وہ شوٹنگ تھی ایڈورٹائزمنٹ کی اور یوں ہم پہلی مرتبہ انجانے میں سارے آندھرا پردیش میں نظر آئے تھے اور الحمدللہ کلام اللہ کے قاری ہونے کی برکت سے آج تک نظر آرہے ہیں جب کہ حال ہی میں گزرے رمضان سے پہلے ۲۰ر شعبان ۱۴۴۲ھ کو اس چینل دور درشن پر ''آداب حیدرآباد'' رمضان خصوصی پروگرام میں قرأت پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ اب تو اس چینل کا نام بدل کر سپتا گری کر دیا گیا ہے۔

عید کی رات

عید کی رات دراصل عبادت کی رات ہوتی ہے بڑی فضیلت والی مگر ہم نے رمضان ہی عبادت میں گزارا تھا تو بڑا احسان کیا تھا رمضان پر' تو اب عبادت کہاں ہونے والی تھی بلکہ اب تو شاپنگ کی رات تھی۔ ویسے تو رمضان مبارک شروع ہوتے ہی مدینہ بلڈنگ سے لے کر چار مینار تک روز آنہ عید کی شاپنگ شروع ہو جاتی تھی اور کیا چیز تھی جو وہاں نہیں ملتی تھی اور اب تک جو لوگ عید کی شاپنگ نہیں کئے تھے' وہ آج کی رات ''شاپنگ نائٹ'' کے عنوان سے گزارتے اور آج کی رات وہاں کا منظر ہی کچھ اور ہوتا۔ مرد و زن' بچے بڑے سب اس ''رمضان بازار'' میں خریداری کرتے نظر آتے۔ جم غفیر کا یہ عالم ہوتا کہ سانس لینا بھی ایک فن نظر آتا۔ عام طور پر ہم عید کی چپل اسی رات کو اسی بازار میں اپنے ماموں زاد بھائی ''عادل میاں'' کے ساتھ جا کر خریدتے اور اس وقت یہ بازار صبح چار بجے تک کھلا رہتا اور اب عالم یہ ہے کہ فجر کے وقت بھی دُکانیں کھلی رہتی ہیں اور دوکانداروں کی تمنّا اور خریداروں کی آرزو یہ ہے کہ اے خدایا اس شاپنگ والی عید کی رات کو بجائے بارہ گھنٹے کے چوبیس گھنٹے کر دے اور قدرتِ خداوندی سے ایسا ہو بھی جائے تب بھی نہ یہ بیچنے والوں کے

دل بھریں گے نہ خریدنے والوں کے۔ بہت ساری دوکانیں آدھی رات کے بعد بند کردی جاتیں لیکن درزی حضرات جو انتہائی معصوم اور بے بس چہروں کے ساتھ رات بھر اپنی دوکانیں کھلی رکھتے تاکہ گاہکوں کو عید کے کپڑے پہنا سکیں مگر پھر بھی کئی احباب عید کے دن شکوہ کرتے نظر آتے کہ بھئی درزی نے کپڑے نہیں دیئے اور یہ خوبصورت سلسلہ آج تک جاری وساری ہے۔ ممکن ہے اس میں برکت ہو کیونکہ بعض مرتبہ ہم کو بھی اس تجربہ سے گزرنا پڑا۔ کاش کہ یہ درزی حضرات کپڑے لیتے وقت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے تو سب خوشی خوشی عید کے کپڑے پہن کر نماز کیلئے جاتے اور درزی حضرات کیلئے ان کی دل سے دُعا نکلتیں۔ ایسا سب درزی تو نہیں کرتے مگر اکثر ایسا ہی کرتے خیر۔ رات کو تو گزرنا ہی تھا چاہے عبادت میں گزرے چاہے شرارت میں۔ اکثر خواتین رمضان کی عید کی رات مہندی کا اہتمام کرتیں تاکہ صبح عید ہو تو ان کے رنگ برنگی کپڑوں کے ساتھ ہاتھ بھی جاذب نظر اور خوشنما نظر آئیں۔ اسوقت تک تو بات مہندی اور چوڑیوں تک ہی محدود تھی مگر آج لیپا تھوپی کے جواوزار بازارِ حسن میں نظر آتے ہیں' اللہ کی پناہ! الامان والحفیظ۔ توبہ توبہ۔ میک اپ کا ایسا غازہ چہرہ پر ملا جاتا ہے کہ عورت کی صورت ہی بدل جائے۔ رات میں بغیر میک اپ کے جو بھولی بھالی صورت ہوتی ہے وہ تیار ہوتے ہوتے ایسی شکل اختیار کرلیتی ہے کہ دیکھنے والوں کو وہ تیسری دنیا کی کوئی انوکھی اور ڈراؤنی مخلوق معلوم ہوتی ہے۔

عید کی صبح

عید کی صبح نمازِ فجر کے ساتھ ہی عید کی نماز کی تیاری شروع ہوجاتیں۔ نئے کپڑے' نئی چپلیں' نئی بنیان' نئی ٹوپی سب امی جان تیار رکھتیں اور ساتھ ہی چھوارے (کھجور) اور شیر خرمہ بھی تیار ہوجاتا اور پھر ہم عیدگاہ جانے سے قبل امی جان کے بنے ہوئے انتہائی لذیذ شیر خرمہ سے لطف اندوز ہوتے اور اس سنتِ مبارکہ کو عیدگاہ جانے سے قبل طاق عدد کھجور کھائے جائیں عرف عام میں اس کو ''روزہ کھولنا'' کہتے اور ہر گھر میں تقریباً شیر خرمہ پی کر ہی نماز کیلئے جاتے۔ عموماً میں اور ابا جان سائیکل پر عیدگاہ میر عالم جاتے اور عید کی نماز وہیں ادا کرتے۔ کبھی کبھی ہم مکہ مسجد میں بھی عید کی نماز ادا کرتے۔ عیدگاہ میر عالم میں ہزاروں لوگ نماز پڑھتے۔ وہاں کا منظر ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں جائے نماز، سفید کپڑوں میں ملبوس مصلیانِ کرام مختلف راستوں سے زبان پر تکبیر کا وِرد جاری رکھے عیدگاہ پہنچتے۔ ہم عیدگاہ کے باب الداخلہ پر ہی ہوتے کہ دور دور تک مائک سے مولانا حسام الدین عاقل رحمتہ اللہ علیہ کا دل موہ لینے والا بیان ہوتا رہتا اور پھر قاری عبداللہ قریشی الازہری رحمتہ اللہ علیہ کا فصیح و بلیغ خطبۂ عید اور نماز سننے کو ملتی۔ نمازِ عید ادا کرنے کے بعد سب خوشیوں بھرے چہرے سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے۔ مبارکباد دیتے اور گنگا جمنی تہذیب کا تو یہ عالم تھا کہ عیدگاہ میں پولیس افسران اور ان کا عملہ مصلیوں کو مبارکباد دیتا اور گلے ملتا بلکہ بعض بعض مرتبہ تو بچوں کو عملہ کی طرف سے چاکلیٹ بھی دیئے جاتے اور مسلم محلوں میں تو موجود ہندو بھائی گھروں میں عید ملنے آتے۔ میرا بچپن کا ایک دوست تھا جس کا نام مُرلی تھا۔ وہ ہماری صحبت میں رہ کر نیم مسلمان ہوگیا تھا۔ وہ سورہ الفاتحہ اور قل کا سورہ پڑھتا تھا۔ کچھ دُعائیں بھی اس نے یاد کرلی تھیں۔ عید کے دن وہ سب دوستوں کے گھروں میں شیر خرمہ کے مزے اڑاتا۔ ابھی تو پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے مگر دُعا ہے کہ جہاں بھی ہو وہ سلامت رہے اور مرنے سے پہلے ایمان کی دولت نصیب ہوجائے۔ آمین۔

عید کے دن بچوں کی خوشیاں اور مصروفیات

عید کے دن بچوں کی دو ہی خوشیاں ہوتی (بریانی کھانا' شیر خرمہ پینا) اور عیدی وصولنا۔ عید کے دن سب مل کر کھانا کھالیتے تو اب باری ہوتی عیدی لینے کی اور اس وقت عیدی کا ریٹ مختلف ہوتا۔ کہیں دس روپئے دیے جاتے تو کہیں بیس' کہیں کچھ زیادہ تو کہیں کچھ کم اور شام تک گھر میں اور پڑوس میں ملنے والی عید جمع کرتے تو پچاس' سو روپئے ہوجاتے تو ہماری خوشیوں کی انتہا نہیں رہتی اور ہم اس وقت اپنے آپ کو امیر تصور کرتے کیونکہ اس وقت پانچ پیسے بھی چلتے تھے اور اس میں بہت کچھ ہم خرید لیتے تھے۔ بڑے اہتمام سے ہم دن بھر اڑوس پڑوس میں عید ملنے جاتے اور ہر جگہ دُعاؤں کے ساتھ شیر خرمہ بھی مل جاتا اور کہیں کہیں عیدی بھی۔ ہر گھر میں عید کے دن دو عطر ضرور ہوتے۔ پہلا مجموعہ 96 اور دوسرا شمامتہ العنبر۔ کہیں کہیں جنت الفردوس کی شیشیاں بھی دیکھنے کو ملتیں۔ عید آنے سے پہلے ہم غلّہ خرید لیتے اور عیدی اس میں جمع کرلیتے اور سال بھر کے پلان آہستہ

آہستہ اس عیدی سے پورے ہوتے۔ ہمارے گھر سے پانی کی ٹانکی جانے والی روڈ پر ''چاند بھائی'' کا پان کا ڈبہ تھا جہاں پان سگریٹ کے ساتھ شیشے کے مرتبان میں تل کے لڈو، میسور پاک اور نیوٹرین چاکلیٹ جو آج کے ڈیری ملک چاکلیٹ کے برابر ہوتا' کمرگھٹ، کھوپرے کے قریش، سنگترے کے قریش، فٹافٹ اور رس گلے بھی رکھے ہوتے اور یہی ہمارا شاپنگ مال ہوتا اور یہیں ہماری عیدی کی مرادیں پوری ہوتیں اور یہی ہماری خوشیوں کا مرکز تھا۔ عید کے دنوں میں کچھ پھیری والے خصوصاً نمودار ہوتے اور بچوں کی عیدیوں سے اپنی جیبیں اچھی خاصی گرم کر لیتے۔ ان میں برف کے لڈو والا، موسمبی چورن والا، کاڑی میں گلابی رنگ کی بڈھی کے بال والا اور چنگم نما مٹھائی والا جو مٹھائی کو لکڑی کے اوپری سرے پر لگا لیتا اور دوسرے ہاتھ سے ایک مخصوص قسم کی آواز والا پنکھا پھراتا آتا جس کے پاس بچے پانچ پیسے، دس پیسے کا خریدتے تو ان کے ہاتھوں پر وہ چنگم نما مادے سے گھڑیاں بناتا (بچے اسے گھڑی کی مٹھائی والا بھی کہتے) ہمارے لئے یہی گھڑیاں اس وقت بہت قیمتی ہوتیں جو خوشنما بھی ہوتیں اور جب جی چاہا لذت بھی دے جاتیں۔ ان ہی دنوں میں ایک صاحب مخصوص قسم کا ڈبہ اٹھائے چلے آتے جس میں چاروں طرف شیشے لگے ہوتے اور اس میں وہ گانے اور فلمیں دکھاتے جو چند منٹ کے ہوتے اور کچھ پھیری والے ہاتھ میں مخصوص قسم کا کیمرہ لئے چلے آتے اور پانچ دس پیسے لے کر تصاویر دکھاتے۔ یہ تصاویر کہیں مکہ، کعبہ اور حرم نبوی ﷺ اور مذہبی مقامات پر مبنی ہوتیں تو کہیں دنیا کے مشہور شہروں اور مقاماتِ تفریح پر مبنی ہوتیں اور مجھے یاد ہے غالباً وہ کہتا بھی زبان سے کہ آؤ دنیا دیکھو وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے بچپن میں ایک کرکٹ ٹیم تھی۔ کہنے کو تو وہ کرکٹ ٹیم تھی لیکن ہر کھیل ہم ساتھ کھیلتے۔ رنگ برنگی خوبصورت گولیاں' گلی ڈنڈا' نگورچہ' چھپم چھپی' مارم پٹی' فٹبال' پتنگ اڑانا' لٹو پھرانا مگر عید کے دن سب کھیل موقوف ہو جاتے اور بعد ظہر تفریح کا پروگرام بناتے اور سورج ڈھلنے کے بعد کھیتوں میں چلے جاتے' گور کی املی توڑتے اور خوب کھاتے اور کھیلتے اور خوب شرارت کر کے مغرب کے قریب واپس لوٹتے اور پھر عید کے دن کا سورج جیسے ہی غروب ہونے لگتا' اس کے ساتھ ہی اپنی خوشیاں بھی اگلے دن کیلئے اس کے پاس گروی رکھ دیتے تا کہ دوسرے دن سورج کے طلوع کے ساتھ ہی اپنی خوشیاں واپس لے سکیں۔

آہ! کیا وہ رمضان اور عید کے دن تھے کہ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں اور چیزیں پرسکون و اطمینان' دلوں میں محبت، آنکھوں میں خلوص' جذبہ ایثار و ہمدردی' ہر ایک کی زبان سے ٹپکتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ عید کے دن کو اللہ عزوجل نے خوشیوں اور رنگوں سے بھر دیا ہو۔

آہ! کیسی وہ بھولی بھالی دنیا تھی اور کیسی اس وقت کی عبادتیں تھیں۔ کس طرح کی وہ صبحیں' شامیں اور راتیں تھیں اور کیسی وہ خوشیاں تھیں اور خوشیوں بھری دنیا تھی۔

آج جب ہم ایک لحظہ کیلئے اپنے بچپن کا آج کے بچپن سے بالخصوص کورونا وائرس کے بعد والے حالات سے تقابل کرتے ہیں تو ہم کو ہر جگہ بے اطمینانی، بے چینی، بیدردی، بے امنی، بے توجہی، خود غرضی اور منافقت نظر آتی ہے۔ آج باپ بیٹے کا نہیں، ماں بیٹی کی نہیں، بہن بھائی کی نہیں، بھائی بہن کا نہیں۔ آج وہ معصوم آنکھیں جن آنکھوں میں بچپن کی خوشیاں سجتا تھا، وہ آنکھیں دنیا بھر میں بے شرمی، بے غیرتی اور انسانیت کو شرمسار کر دینے والے وہ بے حس مناظر دیکھ رہی ہیں جو نزول آدم سے لے کر آج تک شاید ہی کسی نے دیکھے ہوں۔ زندگیوں کا کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ بچہ بھی مر رہا ہے' بوڑھا بھی مر رہا ہے اور جوان بھی' مرد بھی مر رہے ہیں اور عورتیں بھی۔ اب وہ دن ختم ہو گئے جب شام ہوتی تو لوگ سکون و آرام کی نیند سو جاتے تھے اور اب وہ بھی دن ختم ہو گئے کہ محلہ کی بوڑھیاں ہمیں دعائیں دیا کرتیں کہ بیٹا ''بڈے بڈے ہو کو جیو'' اور لوگ ساٹھ، ستر سال تو یوں ہی آسانی سے جی لیتے تھے اور جن کی عمریں یاوری کرتیں وہ سنچری بناتے نظر آتے اور ہم ان کی گودوں میں کھیلا کرتے اور ان کی لوریاں اور کہانیاں سنتے اور سنتے سنتے سو جاتے۔

کاش کہ وقت واپس لوٹ جاتا اور آج کے بچپن کو وہی ساری خوشیاں دے جاتا جو اس نے ہم کو دی تھیں۔ کاش ایسا ہوتا اور اے کاش۔۔۔ ایسا ہو سکتا؟

اپنی اس خوبصورت یادوں کو میں اس شعر کے حوالے کر کے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی۔عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ، مصر

خواتین کا عالمی دن اور مصری خاتون

دنیا ہر سال یعنی 8/مارچ کو خواتین کا عالمی دن منا رہی ہے اور اس کا مقصد صنفی مساوات کو حاصل کرنا، مختلف شعبوں میں خواتین کو بااختیار بنانا، ان کے خوابوں، ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کو پورا کرنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرنا، دنیا بھر کے معاشروں کو خواتین کے مضبوط اور بااثر حالات کی یاد دلانا، ان کی کامیابیوں کا جشن منانا، خواتین کے مسائل پر توجہ دے کر صنفی مساوات کی حمایت کرنا اور خواتین کے موثر کردار کو اجاگر کرنا ہے۔ ہم خواتین کی بہت سی کامیاب مثالیں دیکھتے ہیں، جنھوں نے تعصب اور تفریق کے دقیانوسی تصورات کو توڑا ہے۔ تمام معاملات بالخصوص اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے انہوں نے جو جہد وجہد کی ہے، جو قابل تعریف ہے۔ کام کرنے کا حق، تعلیم، صحت، معاشی برابری جیسے شعبوں میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان کا عزم اور ان کا کردار کمال کا ہے۔

مصر کی تاریخ مختلف شعبوں میں خواتین کے حیرت انگیز کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ عہد قدیم اور قرون وسطی سے لے کر جدید دور تک، مصر کی معاشرے میں بہت سی کامیاب خواتین کی زندگی ایک نمونہ ہے۔ بہت سی با صلاحیت مصری خواتین نے کئی شعبوں میں نمایاں اور باوقار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جیسے ہی انہیں مواقع میسر آئے، انہوں نے اپنے پوریحوصلے اور نہ ختم ہونے والے عزم کے ساتھ اپنی موجودگی کا ثبوت دیا اور مقامی اور بین الاقوامی سطح تعلیم، صحافت، سیاست، ہوابازی، سائنسی تحقیق وغیرہ شعبوں میں دھوم مچادی۔

8/مارچ کو عالمی یوم خواتین کے ساتھ ساتھ مصر میں ہر سال 16/ مارچ کو مصری خواتین کا دن منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کا انتخاب خاص طور پر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ مختلف تاریخی مراحل میں مصری خواتین کی زندگی میں اہم مقامات کی یاد رکھتی ہے، جن میں نوآبادیات کے خلاف ان کی بغاوت، آزادی کے لئے ان کی جدوجہد اور ان کے دو اہم ترین سیاسی حقوق حاصل کرنے کی یاد ہے۔ یہ یوم شہادت ان شہداؤں کی تاریخ ہے جو تقریباً 100/سال قبل انگریزوں کے قبضے کے خلاف لڑائی میں شہید ہوئیں۔ مصری یوم خواتین کی تاریخ 16/ مارچ 1919ء کو شروع ہوئی، جب خواتین نے جدید مصر کی تاریخ میں پہلی بار انگریزی قبضے کے خلاف سڑکوں پر احتجاج کیا۔ اس کی شروعات حقوق پرست رہنما مسز ہدی شعراوی کی جانب سے انگریزوں کیقبضے کے خلاف خواتین کے مظاہرے کی دعوت سے ہوئی۔ انہوں نے خواتین کے ایک ایسے مظاہرے کی قیادت کی جسے اپنی نوعیت کا پہلا مظاہرہ سمجھا جاتا تھا۔ اس میں 300/ سے زائد مصری خواتین نے شرکت کی۔ مظاہروں کے دوران کچھ خواتین 'وطن کی شہید' بن گئیں، اور اس دن سے لڑائی مصری خواتین کے اپنے حقوق اور اپنے ملک کے حقوق کے دفاع کے پیغام کا حصہ بن گئی۔ اس

مظاہرے کے ذریعہ انھوں نے پہلی مصری فیڈریشن برائے خواتین کے قیام، خواتین کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے اور سماجی وسیاسی مساوات کو یقینی بنانے کا مطالبہ کیا۔

16/مارچ 1923ء کو ہدیٰ شعراوی نے مصر میں پہلی خواتین یونین کے قیام کا مطالبہ کیا، جس کا مقصد خواتین کو ان کے سیاسی اور معاشرتی حقوق حاصل کرنا اور مرد کے ساتھ مساوات حاصل کرنا تھا، نہ صرف یہ، بلکہ لڑکیوں کو یونیورسٹی تک تمام مراحل میں عوامی تعلیم حاصل کرنے اور شادی سے متعلق قوانین میں اصلاحات کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے قانون سے مطالبہ کیا کہ وہ شادی، تعلیم اور سیاسی حقوق کے استعمال سے متعلق مصر کے قوانین کو تبدیل کرے۔ 16/مارچ کا یہ واحد متاثر کن واقعہ نہیں تھا، جس کا مرکزی کردار مصری خاتون تھیں۔ 16/مارچ 1928ء کو پہلی لڑکیوں کا گروپ قاہرہ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ کئی خواتین نے تعلیم اور عوامی ملازمت کے حق کو یقینی بنانے کے لئے پیشہ ورانہ شعبوں میں کامیابی حاصل کی ہے۔ پہلی مصری خاتون نے لیسٹر آف رائٹس کی ڈگری حاصل کی اور پہلی مصری اور عرب وکیل کی حیثیت سے منیرہ کا نام 1924ء میں مخلوط عدالتوں کے سامنے وکلاء کی فہرست میں درج کیا گیا۔ ہیلینا سیڈاروس نے طب کے میدان میں کامیابی حاصل کی اور پہلی مصری ڈاکٹر بن گئی۔ خواتین نے سماجی انصاف پر اصرار کیا اور سائنسی طور پر اعلی درجے حاصل کئے۔ 16/مارچ 1956ء کو مصری خواتین پارلیمنٹ کی رکن بن گئیں۔ مصری آئین نے انہیں امیدوار بننے کی اجازت دی تھی اور انہیں پارلیمنٹ کے انتخابات میں ووٹ ڈالنے کا حق بھی دیا تھا۔

آج سو سال اور اس سے زیادہ عرصے کے بعد، مصری خواتین تمام شعبوں میں اپنی صلاحیت، قابلیت کی بنیاد پر حقیقی طور پر بااختیار بننے کا ثمر حاصل کر رہی ہیں۔ مصری خواتین اب ایسے اہم عہدوں پر فائز ہو رہی ہیں جو پہلے انھیں میسر نہیں تھے۔ آج کی مصری خواتین کامیابی کی علامت بن چکی ہیں، ان کی رسائی ججوں کے پلیٹ فارم تک ہو چکی ہے۔ خواتین کچھ دن قبل ہی عدلیہ کی اس مسند تک پہنچ گئیں، جو اب تک صرف مردوں کے لئے مخصوص تھی۔ مصر کی تاریخ میں پہلی بار 5/مارچ کو جج رضوی حلمی مسند عدالت پر بیٹھیں۔ مصر کی عورت کو اس کامیابی کا سہرہ 'امنیہ جاداللہ' کے سر باندھا جانا چاہئے، جنہوں نے قانون میں گریجویشن کیا اور بعد میں قانون میں ماسٹر ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ انھوں نے The Platform is Her Right کی شروعات بھی کی اور انسانی حقوق کے بارے میں آگاہی پیدا کرنے، لڑکیوں کی حمایت کرنے اور مصری خواتین کی عدلیہ تک رسائی سے روکے جانیکے معاملوں کے حوالے سے امتیازی سلوک کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں بیداری پیدا کی۔ وہ خواتین کے اعلی منصب پر پہنچنے کی پرزور وکالت کرتی رہی ہیں۔ عدالتوں میں خاص طور پر اور معاشرے اور عمومی طور پر خواتین کی ترقی کے معاملوں پر وہ بے حد یقین رکھتی ہیں۔ انھوں نے خواتین کے پسماندہ رہنے اور ریاستی کونسل کے اندر ان کے حقوق دبائے جانے کے معاملات کو پوری طرح مسترد کیا ہے۔ جب کونسل نے ایک خاتون کا بحیثیت جج تقرر کرنے سے انکار کیا تو امنیہ نے ریاستی کونسل میں بطور معاون مندوب مقرر ہونے کی اپنی اہلیت کے حوالے سے ایک مقدمہ دائر کیا۔ جس میں ان کا دعوی تھا کہ تقرری اور

ملازمت کی شرائط کے مطابق انھیں بھی ریاستی کونسل میں عدلیہ کے پوڈیم تک پہنچنے کا موقع ملنا چاہئے۔ 'جداللہ' نے خواتین کی عدلیہ تک رسائی کے حق کے دفاع کے لیے اپنی مہم جاری رکھی، یہاں تک کہ صدر جمہوریہ نے فیصلہ جاری کر دیا اور اب ریاستی کونسل میں 98/خواتین جج اپنے ساتھی ججوں کے ساتھ بنچ پر بیٹھنے کی حقدار ہوگئی ہیں۔

مصر میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس وقت یہاں ایک خاتون وزیر سیاحت ہے۔ اب تک یہ عہدہ روایتی طور پر مردوں کے ماتحت اور ان کی بالادستی میں رہا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایک خاتون کی قیادت میں اس شعبہ نے بہت زیادہ کامیابیاں حاصل کی ہیں، انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خواتین دنیا میں تبدیلی لانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے داخلی اور خارجی طور پر مصر کی بہترین نمائندگی کر کے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی بھی چیز ناممکن نہیں ہے۔ انھوں نے تعصب کے سانچے کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی اور اس عہدے پر کام کر کے 2019ء میں مصر کی تاریخ میں سیاحت سے ہونے والی آمدنی کے پرانے ریکارڈ توڑ دئے۔ ان کیعلاوہ بہت سی ایسی عظیم مصری خواتین ہیں، جو اپنی پیشہ ورانہ اور ذاتی کامیابیوں کے ذریعے ہر روز صنفی اور جنسی تعصّبات کو توڑ رہی ہیں۔ مصری سینیٹ (پارلیمنٹ) میں خواتین کی غیر معمولی موجودگی کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں خواتین کی شرح 45/فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ حکومت میں خاتون وزراء کا تناسب 25/فیصد تک پہنچ گیا۔ یعنی وزراء کا ایک چوتھائی حصہ خواتین پر مشتمل ہے۔ گذشتہ کئی برس کے دوران مختلف ریاستی اداروں میں خواتین نے کی نمائندگی میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ خواتین نے پہلی بار قومی کونسل برائے انسانی حقوق کی صدارت حاصل کی، ریاستی کونسل اور انتظامی پراسیکیوشن میں بھی ان کو اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع ملا۔ مرکزی بینک کی پہلی ڈپٹی سربراہ، ڈپٹی گورنر، صدر جمہوریہ کی مشیر برائے قومی سلامتی اور اقتصادی عدالت کی پہلی خاتون صدر ہونے کا شرف بھی مصری خواتین کا حاصل ہو چکا ہے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ بعض سیاست دانوں نے خواتین کے ساتھ تفریق اور سوتیلے برتاؤ کے خلاف چل رہی خواتین کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان کے حقوق کی بازیابی کی راہ ہموار کرنے میں مدد کی ہے۔ انھوں نے خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے کام کیا ہیاور مختلف شعبوں میں خواتین کی صلاحیتوں کا کھل کر اعتراف کیا۔

آخر میں، میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ وہ تعصب اور تفریق جو عورت کی ترقی اور اس کے آگے بڑھنے کو مشکل بنا ئے اس کو مٹا دینا چاہیے۔ چاہے یہ تعصب اور تفریق جان بوجھ کر ہو یا انجانے میں۔ تعصب وتفریق کو توڑنے کے لیے، معاشرے کو سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ ناروا سلوک ہے۔ میرے خیال میں خواتین کے ساتھ اختیار کئے جانے والا تعصب ایک سماجی مسئلہ ہونے سے پہلے ایک خاندانی مسئلہ ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ خواتین کے خلاف تعصب سب سے پہلے کنبے اور خاندان سے شروع ہوتا ہے۔ دراصل تعصب اور تفریق کا رواج بہت سے خاندانوں میں فطری معلوم پڑتا ہے، کیونکہ اخلاقی اور روایتی لحاظ سے نسلوں کو یہ تعصب وراثت میں ملتا ہے۔ اس کو ہمارے بچوں، مردوں اور عورتوں کی طرف سے بڑھایا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر میں کہنا چاہوں گی کہ اس تعصب کو ختم کرنا صرف قانون سازی سے مکمل نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے لئے گھروں،

دفتروں، کارخانوں، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور ہمارے آس پاس کی جگہوں پر بیداری پیدا کرنا ہوگی، تاکہ اس صنفی اور جنسی تفریق وتعصب کا خاتمہ ہو۔اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ عورت اور مرد مل کر ایک محفوظ اور مستحکم معاشرہ بناتے ہیں۔

اس بات سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ عورت معاشرے کا نصف حصہ ہے۔ وہی خوشی کا منبع ہے۔اپنے اردگرد رہنے والوں کے لیے طاقت اور توانائی کی بنیاد ہے۔اپنے شوہر اور بچوں کے لیے نرمی اور محبت کا سرچشمہ ہے۔ وہ ماں ہے، بیوی ہے، بیٹی ہے اور بہن ہے۔اسلام عورت کو ممتاز کرنے اور اسے اپنے خاندان میں ایک خاص مقام دینے کا خواہاں ہے۔ایام جاہلیت میں بھی اسلام نے قبیلوں کے غیر انسانی رسم ورواج کو بدل کر لڑکیوں سے محبت کرنے کا حکم دیا، جو معاشرہ لڑکیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اس کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی میری وصیت قبول کرو۔اللہ تعالی نے بھی قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے: ترجمہ ''میں تم میں سے عمل کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، وہ مرد ہو یا عورت۔تم آپس میں ایک ہی ہو۔'' ایک جگہ اور ارشاد فرمایا گیا: ترجمہ،''جس نے نیک کام کیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی کے ساتھ ضرور زندہ رکھیں گے اور ہم ان کو ان کے نیک کاموں کی ضرور جزا دیں گے۔'' آخر میں ہر اس خاتون کو میں سلام پیش کرتی ہوں، جس نے ہمیشہ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ وہ ترقی اور تعمیر میں قوم کی ڈھال اور تلوار ہے۔

فضیل فوز۔حیدرآباد

آمدِ رمضان

ماہ جو سب مہینوں میں ذی شان ہے
دوستو ماہ وہ ماہِ رمضان ہے

برکتوں رحمتوں کا مہینہ ہے یہ
سیّد المرسلیں کا یہ فرمان ہے

جس کے دامن میں ہے لیلۃ القدر بھی
جس میں پوشیدہ بخشش کا سامان ہے

لوٹ لو مغفرت کے خزانے سبھی
دیر کس بات کی ماہِ غفران ہے

قید ہوتے ہیں اِس میں شیاطین سب
رَہ رَوِ راہِ حق کا یہ ایمان ہے

ہوگیا پھر عطا ماہِ رمضاں ہمیں
ساتھیو ہم پہ یہ فضلِ رحمٰن ہے

سب کو بخشے خدا سب کو جنّت ملے
فوزؔ کا بس یہی ایک ارمان ہے

ڈاکٹر علیم خان فلکی- صدر سوشیو ریفارمس سوسائٹی، حیدرآباد

60+ لوگ۔ایک بوجھ یا رحمت؟

ہر گھر میں کم سے کم دو لوگ ایسے موجود ہیں جو 60+ ہیں۔ گوگل کے مطابق ان لوگوں کی آبادی کا فیصد 18 ہے۔ یہ گھر والوں کے لئے تو شائد ۔۔۔ شائد ایک بزرگ اور رحمت ہیں لیکن یہ قوم اور امت کے لئے ایک رحمت ہیں یا بوجھ، آیئے اس کا جائزہ لیں۔

یہ وہ خوش قسمت لوگ ہیں جن کے پاس وہ دولت ہے جو باقی 78% لوگوں کے پاس نہیں۔ کئی ایک کے بچے سیٹ ہیں۔ ان کے پاس وقت ہے، وسائل ہیں تجربہ ہے اور تعلقات ہیں۔ یہ لوگ خبروں سے بھی واقف رہتے ہیں، قوم کے جو بھی حالات ہیں یہ دیکھ کر اگر ان کا ضمیر زندہ ہے تو بے چین بھی ہوتے ہیں۔ یہ چاہیں تو قوم کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر ہماری آبادی بیس کروڑ ہے تو اس حساب سے 60+ لوگوں کی تعداد 3.6 کروڑ ہے۔ اگر ان میں سے فرض کرلیں کہ صرف ایک کروڑ ہی ایسے ہیں جو اب بھی صحت مند چاق و چوبند ہیں، تو یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ ملک میں کوئی بھی انقلاب لانے کے لئے کافی ہے۔ گوگل پر ایک سرخی دیکھئے 25% Revolution۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ ایران، فلپائن، عرب اسپرنگ حتیٰ کہ خود آر ایس ایس کا انقلاب صرف 2.5% آبادی ہی کی محنت اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ باقی آبادی جانوروں کی طرح ہوتی ہے جس کی پوری توجہ صرف اپنے پیٹ بھرنے پر ہوتی ہے۔ اگر 60+ لوگ تحریکوں کا ساتھ دینے ہمت کرلیں تو صرف دو چار سال میں ہماری، ذلتیں، غربت، سیاسی زوال، ارتداد، نئی نسل کی آوارگی، اور بیروزگاری ختم ہوسکتے ہیں۔ کسی بھی تحریک کو اٹھانے کے لئے پہلے قدم پر والنٹرز کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن والنٹرز دور دور تک نہیں ہیں۔ جو ہیں وہ داماد یا صدھی کی طرح کسی میٹنگ میں شرکت کرسکتے ہیں لیکن کوئی ذمہ داری اٹھانا ان کی شان کے خلاف ہے۔ نوجوانوں کو تو خیر روزگار کا بہانہ کرنے کا حق ہے۔ لیکن یہ 60+ لوگ ۔۔۔۔۔۔ افسوس ہوتا ہے ان سے مل کر۔ اِس عمر میں بھی اگر کوئی بات ان کے فائدے کی ہو تو بھاگ دوڑ کرسکتے ہیں لیکن اگر قوم کے لئے کچھ کام کرنے کی بات ہو تو ان کا رویّہ ایک معذور، مجبور، عاجز فقیر کی طرح ہوجاتا ہے۔ چونکہ سینیاریٹی ان کی سائیکالوجی میں بس چکی ہے۔ یہ اب صرف مشورے، تبصرے، اعتراضات یا اپنی بڑائیاں کرسکتے ہیں، کام نہیں کرسکتے اور نہ کسی کو اپنا لیڈر تسلیم کرسکتے ہیں۔ یہ ہر جگہ خود ہی لیڈر، خود ہی دانشور، خود ہی عالم اور خود ہی مفتی ہوجاتے ہیں۔ اور اگر ان کے پاس کروڑ دو کروڑ کا مال جمع ہے تو پھر یہ جس اونچائی پر کھڑے ہو کر بات کرتے ہیں، ان کے ذہن میں ہر عالم، ہر قائد اور ہر جماعت بس چندے مانگنے والے افراد کی ہے۔

جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، ان کی پوری زندگی کا مقصد خاندانی سیاست، شادیاں اور دعوتیں ہوتی ہیں۔ ان کو قوم کے لئے کچھ کر گزرنے والے مردوں کی ہرگز ضرورت نہیں بلکہ ان کو شاپنگ کروانے والے، گھر کا سودا سلف لانے والے مردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ مردوں کی تربیت بھی اسی انداز سے کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے

بڑے تیس مار خان بھی گھر کے باہر تو اصلاحِ معاشرہ کی ہر تحریک میں شاندار تقریریں فرماتے ہیں، لیکن گھر کے اندر کی مہارانی جودھا بائیوں کے آگے جھک جاتے ہیں۔

میرے +60 دوستو؛ زندگی ون ڈے کرکٹ میچ کی طرح کا ایک گیم ہے۔ اب آپ اس کے آخری پانچ چھ Overs میں ہیں۔ آپ اپنی زندگی کا کھیل کھیل چکے۔ پچاس اوورس مکمل ہونے کے بعد آپ صرف پویلین میں بیٹھیں گے، آپ کو میدان میں کوئی آنے نہیں دے گا۔ اس سے پہلے کچھ کر جائیے۔ ہمارے باپ دادا نے اپنی جان اور اپنے مال کو بچا بچا کر رکھا۔ اپنے بیٹوں اور دامادوں کی بھی یہی تربیت کی، جس کے نتیجے میں آج ہم سیکنڈ کلاس سیٹیزن بن چکے ہیں۔ اگر آپ بھی اپنی جان اور پیسے کو بچا بچا کر رکھیں گے تو کل آپ کے نواسے اور پوتے تھرڈ کلاس سیٹیزن بننے والے ہیں، خدارا غور کیجئے۔ یاد رکھئے اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تین حصے بنائے ہیں۔ ایک حصے میں آپ ماں باپ اور بھائی بہنوں کے لئے سب کچھ کرتے ہیں، دوسرے حصے میں بیوی بچوں کے لئے یا پھر دامادوں کو خریدنے کے لئے۔ تیسرا حصہ جو عموماً +60 کے ساتھ شروع ہوتا ہے، یہ امت کے لئے ہے۔ اگر یہ بھی کمانے یا خاندان کی چوکیداری میں گزر گیا تو کل بیٹے بہو اور داماد صرف یہ کہہ کر یاد کریں گے کہ بڑے میاں بہت اچھے تھے، ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑ کر مرے، لیکن اس امت کے لئے آپ کا وجود ایک جانور سے زیادہ نہیں ہوگا جو کسی گلی میں مر جائے تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا، اور نہ کوئی یاد کرتا ہے۔ بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ کوئی دو چار قدم آپ کی میت کو کندھا دے دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں عدل وقسط یعنی Justice قائم کرنے کے لئے بھیجا تھا، اور ساتھ ہی ایک قانون کی کتاب بھی دی تھی۔ یہ کتاب آپ نے خود جو زندگی بھر سمجھنے کی کوشش نہیں کی، بس چند عبادتوں سے کام چلاتے رہے، اب آپ کے مرنے کے بعد لوگ آپ کے سرہانے اِسے پڑھتے بیٹھیں گے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جب آپ انصاف کو قائم کرنے کی کوئی تحریک کا ساتھ نہیں دے سکے، بس چند خدمت خلق کے کاموں میں کچھ چندہ دے کر بہت بڑا کارنامہ سمجھتے رہے تو اب دشمن آپ کے ساتھ انصاف کریں گے، وہ انصاف یہ ہے کہ وہ آپ کے دین، کلچر، تاریخ اور اکنامی کو مکمل تباہ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ پوری قوم ڈرائیوروں، سیلز مینوں اور کارخانوں یا کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی قوم بن چکی ہے۔ سرکاری دفتروں، بینکوں، یا بڑے اداروں میں بڑے عہدوں پر آپ کی قوم کا داخلہ بند کیا جا چکا ہے۔ آپ جانتے نہیں کہ آپ کی قوم کی عورتوں میں زنا کاری، فحاشی، ارتداد اور ناجائز ابورشنز کا کیا تناسب ہے؟ چند ایک پیٹ بھروں اور مستی خوروں کا شادیوں میں پیسہ لٹانے کا کیا حال ہے؟ جیلوں میں آپ کی قوم کے قیدیوں کا کیا تناسب ہے؟ سگنلوں پر ریڈ سگنل ہوتے ہی جو فقیروں کی فوج دوڑ کر آتی ہے، وہ کس کی قوم ہے؟ یہودیوں، نصرانیوں یا زعفرانیوں پر سازش کا الزام دینے سے کیا آپ کی ذلتیں کم ہو جائیں گی؟

کرنا کیا ہے؟

دوستو؛ موت بہت قریب ہے۔ یہ مت سمجھئے کہ آپ مر ہی جائیں گے۔ مریں گے نہیں لیکن +60 کے ساتھ ہی کوئی بھی بیماری آپ کو بستر کا کر دے گی۔ تب آپ کی آزادی چھن جائے گی۔ حتیٰ کہ جس پیسے کو آپ نے ساری

زندگی جس طرح بھی کمایا ہوگا اس کو خرچ کرنے کی آزادی بھی آپ کے پاس نہیں ہوگی۔ تنہا گھر یا دواخانے میں قید ہوں گے کوئی ایک دو گھنٹے پاس بیٹھنے والا نہیں ہوگا، یہ موت سے بدتر اسٹیج ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ بے بسی کا عالم آئے قوم کے لئے گھر سے نکلئے اور کچھ کیجئے۔

اِس وقت یقیناً ایجوکیشن، خدمت خلق، اصلاحِ معاشرہ، سیاسی بیداری وغیرہ وغیرہ یہ تمام کام اہم ہیں، لیکن لوگوں کو یہ شعور نہیں ہے کہ جس طرح عمارت کی تعمیر میں بنیاد کے ستون اہم ہوتے ہیں، اسی طرح قوم میں کسی بھی قسم کی تبدیلی لانے کے لئے ایک Mass force کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیس پچیس ممبروں سے یا لاکھ دو لاکھ چندہ جمع کر لینے سے سو یا دو سو غریبوں کا کچھ فائدہ تو ضرور ہوسکتا ہے، لیکن بیس کروڑ مسلمانوں کا جو سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی مستقبل تباہ کیا جارہا ہو، اس کو نہیں بچایا جاسکتا ہے۔ پہلے اپنی ایک عددی طاقت Number strength کو دکھانا لازمی ہے۔ یہ +60 لوگ گھروں سے نکلیں اور ہر جلسے، ہر سیمینار، ہر میٹنگ میں آنے والوں کی تعداد بڑھائیں تو یہ سب سے پہلا قدم ہے اپنی آواز کو منوانے کا۔ دوسری قومیں اپنے مسائل لے کر سینکڑوں کی تعداد میں جب جمع ہوجاتی ہیں اور سڑکوں پر آجاتی ہیں تو ان کے مسائل سنے بھی جاتے ہیں، اور ان کی طاقت تسلیم بھی کی جاتی ہے۔ ایک آپ ہی کی قوم ہے جس کے دل و دماغ میں اتنا خوف بٹھادیا گیا ہے کہ گھروں سے ہی نہیں نکلتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگر کسی میٹنگ میں کوئی معمولی کانسٹیبل بھی آجائے تو بڑی بڑی انقلابی باتیں کرنے والے بالکل اسی طرح بھاگتے ہیں جس طرح بلی کی آہٹ پا کر چوہے بھاگتے ہیں۔

شادی بارات، عرس یا اجتماع میں تو ہزاروں جمع ہوجاتے ہیں کیونکہ وہاں کوئی روک ٹوک نہیں ہے، لیکن بات جب قوم کو بیدار کرنے کی آتی ہے تو قوم کو قانون اور سزاوں کے خوف سے ڈرانے والے دشمن سے زیادہ یہی +60 لوگ ہوتے ہیں۔ کسی بھی تحریک کی دھاک بٹھانے کے لئے سب سے پہلے اس کی میٹنگس میں جمع ہونے والے افراد کی تعداد دیکھی جاتی ہے۔ جہاں صرف پچاس یا سو لوگ جمع ہوں ایسی میٹنگس کی نہ حکومت نوٹس لیتی ہے، نہ میڈیا اور نہ عام آدمی کو اس سے کوئی دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ تحریک کی دعوت دینے والے بے چارے پوری پوری محنت کرتے ہیں، اگر نوجوان نہ آئیں کوئی بات نہیں، یہ وظیفہ یاب بوڑھے ہی اگر ہزاروں کی تعداد میں آجائیں تو ہر دل میں ایک دھاگ بیٹھتی ہے۔ لیکن یہ +60 بوڑھے صرف صلاح الدین ایوبی اور خالد بن ولید یا پھر ارتغرل کی باتیں کرینگے، آگے بڑھ کر اپنی انا کو قربان کر کے کام کرنے والوں کا ساتھ ہرگز نہیں دیں گے۔ ان کے اسی خوف کو پولیس بھی استعمال کرتی ہے، اور یہ اپنے بیٹوں اور دامادوں کی سلامتی کی گیارنٹی لے کر مخبری کرتے ہیں۔ کتنی افسوسناک بات ہے کہ قوم میں مجاہد کوئی پیدا نہیں ہورہا ہے لیکن مخبر سینکڑوں پیدا ہورہے ہیں۔

کانشی رام نے ایک بات کہی تھی کہ جس کی جتنی سنکھیا بھاری اس کی اتنی بھاگیہ داری۔ غیر قوم کے لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل کے لئے سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں اس لئے نیشنل میڈیا، سرکاری ادارے اور حکومت ان کا نوٹس لیتے ہیں اور ان کے مسائل کچھ حل بھی کئے جاتے ہیں، لیکن ہماری قوم صرف سوشیل میڈیا یا اردو اخباروں میں لکھ کر ہی انقلاب لانا چاہتی ہے، کہیں اپنی Mass strength بتانا ہی نہیں چاہتی، کسی کو قائد تسلیم کر کے اس کا ساتھ دینا ہی

نہیں چاہتی۔اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کوئی قومی سیاسی پارٹی آپ سے بات کرنا نہیں چاہتی، بلکہ آپ کو منہ لگانا نہیں چاہتی۔ نہ انہیں آپ کے وجود کی اہمیت ہے نہ ووٹ کی۔ اسلئے آپ ہر اسمبلی، کارپوریشن، پارٹی، پنچایت اور ہر ہر ادارے جیسے عدلیہ، ایجوکیشن، پولیس، فوج، وغیرہ سے باہر ہیں۔ اگر کہیں ہیں بھی تو ان کی حیثیت قصاب کی دوکان کے سامنے دور کھڑے ایک کمزور کتے کی سی ہے جو صرف زیر لب غراتا رہتا ہے لیکن اس کے حصے میں کوئی موٹا چھیچھڑا نہیں آتا۔ آپ گھر میں بیٹھنے کے بجائے ایسی میٹنگس میں شرکت شروع کیجئے۔ شہر میں اتنے اہم سیمینار اور مشاورتی اجلاس ہوتے ہیں، ان میں نہ علما شریک ہوتے ہیں، نہ دانشور، نہ عوام نہ نوجوان۔ اگر ایسے اجلاسوں میں پندرہ بیس ہزار لوگ جمع ہو جائیں تو پھر سیاسی پارٹیاں ہوں کہ سرکاری ادارے، سارے آپ سے خود آکر بات کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے لئے آپ کو سب سے پہلے یہ کام کرنا ہوگا کہ جو چھوٹی چھوٹی تنظیمیں بنا کر چھوٹے چھوٹے کام آپ کر رہے ہیں وہ ضرور کرتے رہئے، لیکن ایک بڑے مقصد کے لئے بڑے کاموں میں کم سے کم وہاں اپنی قوم کا ہیڈ کاؤنٹ یعنی حاضرین کی تعداد کی طاقت بڑھانے کا کام کیجئے۔ اس سے بہت فائدہ ہوگا۔

دوسرا کام یہ کیجئے کہ اپنے دماغوں سے یہ وسوسہ نکالئے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کل آپ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ قوم کے لیڈروں یا جماعتوں نے کوئی انقلاب کیوں نہیں لایا۔ **لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا، ولا تسئلون عن اصحب الجحیم**۔ یعنی آپ سے صرف ایک سوال ہوگا کہ آپ اپنی استطاعت کے مطابق کیا کر کے آئے۔ آپ کو صرف اپنے مال اور اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کا جواب دینا ہے۔ بس کرتے جائیے۔ سرسید کو اگرچہ کہ ساری عمر کافر، مشرک اور مرتد تک کہا گیا، ان کی میت کے لئے بھی چندہ کرنا پڑا، لیکن وہ اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر جو کام کر گئے، آج ان کو مشرک اور کافر کے فتوے دینے والوں کی نسلوں میں جو بے شمار تعلیم یافتہ ہیں، وہ سرسید کے لئے دعائے مغفرت کر رہے ہیں۔ آپ بھی بھول جائیے کہ آپ کو پھول پہنائے جائیں گے یا وزیر اعظم یا چیف منسٹر یا پھر کوئی صدارت یا چیف گیسٹ کی کرسی دی جائیگی۔ اپنے آپ کو ابوبکر، عمر علی رض کی طرح بس ایک والنٹیر بنا کر کام کرنا شروع کر دیجئے۔ اللہ چاہے گا تو آپ سے دنیا میں کوئی بڑا کام لے لے گا ورنہ آخرت میں تو آپ کو جو مقام ملنے والا ہے، اس کی عظمت کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

آخری بات یہ کہ اپنی گھر کی عورتوں کی دلچسپیوں کا رخ موڑیئے۔ عورتوں کی اکثریت کے دل اور دماغ زیور، کپڑوں، رشتوں، دعوتوں، بیوٹی پارلر یا انٹرٹینمنٹ میں اٹکے ہوئے ہیں، ان کو خدارا قوم کے حالات بتایئے۔ یہ نمازیں پڑھ کر یا خیرات کر کے سمجھ رہی ہیں کہ اسلام قائم ہو گیا۔ اسلام قائم ہوتا ہے گھر سے نکلنے اور مردوں ہی کے متوازی تحریکوں کو زندہ کرنے میں۔ وہاں بھی ہیڈ کاؤنٹ ہی کی اہمیت ہے۔ یقین نہ آئے تو غیر قوم کی عورتوں کو دیکھ لیجئے۔ اسی لئے انہیں بھی ہر جگہ ایک ریزرویشن دیا جا رہا ہے۔ اور ہماری عورتیں قومی سطح پر، مذہبی اور کلچرل سطح پر گونگی، بہری اور گونگی ہیں۔

اگر آپ اپنے شہر یا حلقے میں اس موضوع پر کوئی ورکشاپ رکھیں، یا کم سے کم زوم میٹنگ کریں تو ہم آپ کی بہترین رہنمائی کر سکتے ہیں کہ +60 ہونے کی نعمت کا کیسے بہترین استعمال کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید حبیب امام قادری۔حیدرآباد

نظامِ حیدرآباد، کرنل امیر الدین اور خلافت عثمانیہ کے مخفی دستاویزات

خلیفۃ المسلمین عبدالمجید ثانی کی دختر خدیجہ خیریہ عائشہ درشہوار سلطان المعروف شہزادی درشہوار (سلطان سلطنت عثمانیہ کی شاہی خواتین کے لیے استعمال ہوتا ہے) (پیدائش:26 جنوری 1914ء، استنبول انتقال:7 فروری 2006ء، لندن) آخری خلیفۃ المسلمین عبدالمجید ثانی کی صاحبزادی تھیں۔ وہ جس وقت پیدا ہوئیں اس وقت سلطنت عثمانیہ اپنے آخری ایام گن رہی تھی۔ 1924ء میں خلافت کے خاتمے کے بعد ان کے والد عبدالمجید ثانی کو ملک بدر کر دیا گیا اور وہ جنوبی فرانس میں رہنے لگے۔ 12 نومبر 1931ء کو نیس، فرانس میں ان کی شادی آخری نظام حیدرآباد میر عثمان علی خان کے بڑے صاحبزادے اعظم جاہ سے ہوئی۔ 1933ء میں ان کے بطن سے مکرم جاہ اور 1936ء میں معظم جاہ پیدا ہوئے۔ دونوں نے برطانیہ میں تعلیم حاصل کی اور ترک خواتین سے شادیاں کیں۔

شہزادی درشہوار نے آل عثمان کے گھرانے میں خلیفۃ المسلمین کے چشم و چراغ کی پرورش کی ذمہ داری لی۔ ترکی کے خلیفہ عبدالمجید ثانی کی اکلوتی بیٹی درشہوار جدید تعلیم اور مارشل آرٹس کی تربیت کے ساتھ پرورش پائی۔ ان کے ذہن کے ایک گوشہ میں عروج اسلام کی تاریخ اور عثمانیہ خلافت کی زوال کا بہت بڑا اثر رہا۔ اس لیے وہ اپنے آخری ایام غلام سلطنتوں سے دور لندن میں گزارنا پسند کیا۔ نظام کے صاحبزادے کے ساتھ ان کی شادی 17 کروڑ حق مہر کے ساتھ طے پائی۔ اور اس کے بعد ولی عہد کی پیدائش کے بعد انہیں نظام کے تخت کا وارث قرار دیا اور آخری خلیفۃ المسلمین نے اسے اپنی وصیت میں ان کا نام اپنے جانشین کے طور پر رکھا تھا۔ اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ نظام، اپنے وقت کے دنیا کے سب سے امیر ترین حکمران اور معزول خلیفہ کے درمیان ازدواجی اتحاد ایک مسلم حکمران کے ظہور کا باعث بنے گا جو عثمانی حکمرانوں کی جگہ عالمی طاقتوں کے لیے قابل قبول ہو سکے۔ سلطان شہزادی درشہوار، جو اپنے والد کی جانشینی کے لیے جدید تعلیم اور جنگی تربیت کے ساتھ پرورش پائی، حیدرآباد میں اپنی آمد کے بعد سب سے زیادہ مقبول چہرہ بن گئیں۔

1940 میں حیدرآباد کو خلافت کی بازیابی کے لیے تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ ترکی کے آخری خلیفہ عبدالمجید ثانی نے سرزمین ہند کے دکن کے خطے میں دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ان کی خواہش کے احترام میں ان کی بیٹی درشہوار نے نظام کی مالی معاونت سے موجودہ ریاست مہاراشٹر کے شہر اورنگ آباد میں ایک مقبرہ بھی تعمیر کیا جو ترکی طرز تعمیر کا مثالی نمونہ ہے۔

خلیفہ کی موت دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن قبضے سے پیرس کی آزادی کے ساتھ ہی ہوئی۔ منصوبہ یہ تھا کہ خلافت کو حیدرآباد منتقل کر کے معاہدہ لوزان کو ناکام بنایا جائے۔ لندن میں ترک سفارت خانے نے انکشاف کیا کہ ترک حکومت نے برطانوی حکومت سے کہا کہ سلطنت میں کہیں بھی خلافت کی بحالی کی اجازت نہ دی جائے۔ منصوبہ یہ تھا کہ نظام حیدرآباد اپنے پوتے کی جانب سے خلیفہ کیلیے باضابطہ طور پر قبول کریں جسے خلیفہ وِل بھی کہا جاتا ہے بطور عبوری خلیفہ، جسے خلیفہ عبدالمجید ثانی نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔

ٹائم میگزین نے رپورٹ کیا، ''حیدرآباد کے حکمران نظام نے خود کو خلیفہ قرار دینے کی کوشش کی۔ دکن کے مسلمانوں کے لیے اس کی خواہش حیران کن تھی۔ لیکن خلیفہ کی بیٹی' نظام کے وارث اور علی برادران نے ایک ''میٹنگ'' کی جو بہت سے مسلمانوں کو ایک خوش کن سوچ کے طور پر متاثر کیا۔ اگر ان نوجوانوں کی شادی ہو جائے اور ان کے ہاں مرد بچہ پیدا ہو جائے تو اس میں دنیاوی اور روحانی طاقت ایک جاہ ہو جائے گی۔ ملت کو ایک ''خلیفہ حق'' مل جائے گا۔ جس کی مسلمانوں کو تلاش ہے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ نظام خلافت کو امانت کے طور پر سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں، خلافت تحریک، علی برادران کی قیادت میں ایک کامیاب تحریک 1919 سے جاری تھی جس میں گاندھی جی نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہ تحریک ہندو مسلم اتحاد کے لیے علمبردار ثابت ہوئی۔ علی برادران اور گاندھی جی نے ملک بھر میں اس تحریک سے ہندو مسلم اتحاد کو قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ جو بعد میں آزادی ہند کے لیے اہم کردار ثابت ہوئی۔ اس تحریک کو گاندھی جی کی حمایت حاصل تھی۔ انگریزوں کی پالیسی ڈائیڈ اینڈ رول کے خلاف تھی اور جس نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دیا۔

جو پہلی جنگ عظیم میں شکست کے بعد سلطنت عثمانیہ اور خلیفہ کے منصب کے تحفظ کے لیے جاری تھی۔ خلافت کے خاتمے سے ہندوستانی مسلمانوں میں خوف پیدا ہوا کہ نیا خلیفہ برطانوی زیر اثر ہوگا اور اس کے بعد اسے مزید سامراجی مفادات کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ نتیجتاً، علی برادران نے تحریک کے دیگر اراکین کے ساتھ ہندوستان کے سب سے بڑے مسلم قائدین کے پیچھے کھڑے ہو کر انہیں اگلے خلیفہ کے طور پر تسلیم کیا۔ حیدرآباد کے نظام میر عثمان علی خان اپنی رعایا کی اکثریت ہندو ہونے کے باوجود خود کو دنیا کی سب سے بڑی اور بااثر مسلم ریاست کا سربراہ تصور کرتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے خلیفہ کا عہدہ سنبھالنے کے مطالبات کو مسترد کر دیا، لیکن انہوں اس خیال کو ترک نہیں کیا۔

جب تک کہ مکرم جاہ تخت آل عثمان و آل آصفیہ کے سنبھالنے کے قابل نہ ہو جائیاس کو مخفی رکھا گیا۔ تاہم، دوسری جنگ عظیم، خلیفہ کی غیر متوقع موت، خلافت کی منتقلی کو روکنے کے لیے برطانوی راج پر ترکی کا دباؤ، اور ہندوستان اور حیدرآباد میں سیاسی افراتفری نے یہ ناممکن بنا دیا کہ نظام حیدرآباد سے پیرس کے لیے روانہ ہوں، خلافت کے عہدہ کو عبوری خلیفہ کے طور پر قبول کریں اور خلیفہ عثمانیہ کی میت کو خلد آباد میں دفنانے کے لیلیے آئیں۔ ہندوستان میں سیاسی افراتفری بالآخر ہندوستان کی آزادی کے بعد، بہت سے مسلمان جن میں سے دیوبند کے علمائے دین نے ہندوستانی

کی آزادی کے لیے جدوجہد کی اور نظام کی خلافت کو مہر لگائی۔ دکن میں مسلمانوں نے خلافت کا خواب دیکھا۔اس طرح کے ہنگاموں کا سامنا کرتے ہوئے،خلیفہ کی فوری جانشینی ناممکن نظر آتی تھی، کیونکہ مسلم قانون کے مطابق،خلیفہ کو صرف اس وقت دفن کیا جاسکتا ہے جب اس کا جانشین اپنے عہدے پر فائز ہو کر منصب خلافت کو قبول کر لے اور یا اس کی جانشینی کا باضابطہ اعلان کرے۔اس وقت تک خلیفہ کی تدفین ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا گیا،ان کی لاش کو پیرس کی گرینڈ مسجد میں سرد خانے میں رکھا گیا۔

پھر، 1947 یں ہندوستان نے برطانوی راج سے اپنی آزادی حاصل کر لی،لیکن 1948 میں حیدرآباد کو ہندوستان میں ضم کر دیا گیا اور نظام نے اپنی سلطنت کھو دی، جب کہ خلیفہ کا جسم خاکی پیرس میں سرد خانے میں رہی۔عالم اسلام میں کوئی بھی اس قابل نہیں تھا کہ نظام کے پوتے کو اس عہدے کے لیے قانونی طور پر چیلنج کر سکے جیسا کہ اس کا نام خلیفہ کی وصیت میں دیا گیا تھا،اور نہ ہی نظام عبوری خلافت اور خلافت کے خطوط کو قبول کرنے کے لیے باضابطہ طور پر پیرس جاسکتا تھا اور اس کے ذریعے خلیفہ کا انتظام کر سکتا تھا۔ جنازہ، اور اس کے پوتے کو مرحوم کا خلیفہ کا منصب دار اور جانشین قرار دیں۔ناقابل یقین طور پر،خلیفہ کی لاش پیرس کی گرینڈ مسجد میں مزید 10 سال تک رہی، بغیر دفنائے گئے، یہاں تک کہ 1954 میں ایک پیش رفت کی بات چیت ہوئی۔ 1954 میں خلیفہ کی بیٹی اور اب معزول نظام حیدرآباد کی بہو شہزادی درشیوار نے اپنی بہن شہزادی نیلوفر کے ذریعے ایک معاہدہ کیا۔

اس معاہدے میں،نوجوان مکرم جاہ کے خلافت کی کارروائی جو کہ عبوری خلیفہ اعلی حضرت نظام حیدرآباد کے پاس امانت تھی جب تک کہ جاہ بھی اس کی جانشینی کے لیے تیار نہ ہو جائیں، اب اپنا راستہ اختیار کریں گے۔آخر کار حیدرآباد واپس چلے گئے،لیکن خلیفہ کی باقیات کو منجمد نہیں کیا جائے گا،مسلم دنیا کی اجتماعی مرضی کو تسلیم کرتے ہوئے، خاموشی کے ذریعے 1924 کے بعد سے سیاسی خلافت کو ختم کرنے کے لیے خلیفہ کی باقیات کو ایک بے نشان قبر میں سپرد خاک کیا جائے گا،تاکہ ہندوستان میں اس کے اور اس کے جانشین کے درمیان رابطہ ٹوٹ جائے۔یہ معاہدہ کسی اور کے ساتھ نہیں بلکہ سعودی عرب کے شاہ سعود بن عبدالعزیز آل سعود کے ساتھ کیا گیا تھا،جس نے مدینہ میں آخری خلیفہ کو البقیع قبرستان میں نظام اور خلیفہ کی بیٹی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے دفن کرنے کی اجازت مشروط کر دی۔بادشاہ نے باضابطہ طور پر نظام کی جانب سیفر مان کو قبول کیا،جس نے انہیں اپنے پوتے مکرم جاہ کی جانب سے عبوری اختیار کے طور پر قبول کرنا تھا۔اس کے بعد خلافت کیمنصب کو شاہ سعود کے ذریعہ حیدرآباد کے نظام اعلی کے لئے امانت میں رکھا گیا تھا،اور نظام کو اس کی تدفین سے پہلے خلیفہ کا عبوری جانشین قرار دیا گیا تھا،اس طرح مذہبی قانون کے تقاضوں کو پورا کیا گیا تھا۔البقیع میں ایک بے نشان قبر میں خلیفہ کی تدفین کے بعد، دو مقدس مساجد کے متولی شاہ سعود پھر معزول نظام سے ملاقات کے لیے حیدرآباد آئیں۔

5 دسمبر 1955 کو خادم حرمین شریفین شاہ سعود بن عبدالعزیز آل سعود نے نظام حیدرآباد کے معزول نظام خلافت کے منصب کے لیے نظام کے ملٹری سکریٹری کی موجودگی میں ایک میٹنگ کی۔

نظام اور خلیفہ کے انتظامات کا آخرکار احساس ہوا، سوائے ایک معمولی تفصیل کے، نظام اس دوران حکومت سے دستبردار ہوگئے، اوران کی ریاست ہندوستان میں ضم ہوگئی اوروہ راج پرمکھ کی حیثیت عہدہ سنبھالا اور مکرم جاہ کواپنا ولی عہد مقرر کیا۔اس طرح سلطنت آصفیہ کا اختتام ہوگیا۔مکرم جاہ کی جانشینی کوحکومت ہند نے نظام ہفتم کے طور پر قبول کیا۔

لہذا، شاہ سعود کی جانب سے خلافت کے ختم شدہ منصب کے دستاویز موصول ہونے کے بعد، نظام نے شکست قبول کرلی، چاہے وقتی ہی کیوں نہ ہو، اور کاغذات اپنے ملٹری سیکریٹری لیفٹیننٹ کرنل سید امیر الدین کوسونپ دیے، جو منتقلی کے اس میٹنگ میں گواہ تھے۔

نظام نے اپنے قابل اعتماد ملٹری سیکرٹری لیفٹیننٹ کرنل سیدامیرالدین کو ہدایت کی کہ، خلافت کیدستاویز جوخلیفہ عبدالمجید ثانی سے حاصل ہوئے تھے۔صرف امام مہدیؑ کے ہاتھ ہی دیئے جائیں۔کیوں کہ انہوں نیاس بات کا دکھ ظاہر کیا تھا کہ ریاست حیدرآباد اب نہیں رہی نہ ہی اپنے نبیرہ اورخلیفہ عبدالمجید ثانی کینبسہ جانشین مکرم جاہ کوئی گدی اور سلطنت کے حاکم ہوں گیاورخلافت کے منصب کابوجھ سنبھال پائے گے۔عقیدہ نظام آصف جاہ سابع وخاندان آصفیہ میں ائمہ اہلبیت سے محبت وعقیدت تھی۔اس بات کا ثبوت آصف جاہ سابع اوران کے صاحبزادگان کے کلاموں اورکارناموں میں نظرآتا ہے۔جس کی مثال رہنمائے دکن کے خاندان کے پاس پائے جانے والے مخطوطات اور غیرشائع کلام وسلام میں نظرآتا ہے۔ جس میں اعظم جاہ(خلیفہ کے دامادومکرم جاہ کے والد) نے عقیدت کا اظہار کچھ یوں کیا۔

''بارہ مہینوں میں ہوں تذکرہ بارہ امام کا''

معلوم یہ ہوا کہ خاندان آصفیہ سنی عقیدہ' نسبت صدیقی ومسلک حنفی ہونے کے باوجود بارہ اماموں سے عقیدہ ومحبت رکھتے تھے اورخاصہ آصف جاہ سابع امام آخری زماں کے منتظر تھے۔جس کی گواہی ان کے قریبی رفقا دیتے ہیں۔

آصف جاہ نظام سابع کہا کرتے تھے کہ ترکی خلافت اور بعد میں آصفیہ سلطنت کے زوال کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قیامت قریب ہے ظہور آخری زماں کی آمد کا وقت آچکا ہے اوراس عظیم منصب کوصرف امام آخری الزماں ہی سنبھال سکتے ہیں اوراسی وجہ سے ان کوتلاش کیا جائیاورانتظار کیا جائے۔یہ منصب کے دستاویز انہی کے حوالے کئے جائیں۔اس عظیم کارنامہ کوانجام دینے کے لیے ریاست حیدرآباد میں نظام کے قریب وفاداراورپُراعتماد عزت دارو تعلیم یافتہ گھرانہ جس نے سلطنت حیدرآباد کی فلاح وبہبود میں نمایاں رول ادا کیا' جوکہ خودائمہ اہلبیت سے گیارویں امام' امام حسن الاعسکریؑ کی نسل سے ہیں۔اس ہی خاندان کے ایک بزرگ جوسکندر یار جنگ ثانی جس کا تاریخی قصہ مشہور ہے کہ (کرنل سید امیرالدین عسکری سادات تھے۔جوکہ سید سکندر یار جنگ ثانی' نواب سید محمد میرالدین خان بہادر کے پڑپوترے ہوتے ہیں۔سید سکندر یار جنگ ثانی کے بارے میں مشور ہے کہ انہوں نے آصف جاہ ششم نواب میر محبوب علی خاں کوسانپ کاعمل بخشا تھا جوکہ ریاست حیدرآباد دکن میں کافی مشہور تھا۔ریاست کے حدود میں جس کسی کوبھی سانپ ڈس لے تووہ یہ کلمات ''محبوب علی پاشاہ کی

دوہائی ٗ زہر اتر جا ٗ سیسانپ کا اثر ختم ہو جائے گا۔یہ شاہی فرمان ?16 رمضان 1321 ہجری میں جاری کیا۔اگر رعایا میں سے کسی کو سانپ ڈس لے تو سانپ گزیدہ کو کسی وقت بھی رسائی ملنی چاہیے۔چنانچہ متعدد بار ایسا ہوا کہ آپ کو نیند سے بیدار کیا گیا۔(بحوالہ تزکیہ آصفیہ)اب ان ہی کے پر پوترے کرنل سید امیر الدین صاحب کو اس ذمہ داری کو ایک امانت کے طور پر سونپا گیا۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ کرنل سید امیر الدین صاحب کے اجداد آصف جاہ اول کے ساتھ حیدرآباد منتقل ہوئے تھے)اس گھرانے کو اس کے بعد نظام کے ملٹری سکریٹری نے 1955 کے بعد سے ہدایات کے مطابق دستاویزات کو اپنے پاس سنبھالے رکھا۔

نظام نے اپنے خانوادے کے اہم اراکین اور ملٹری سکریٹری کی سرپرستی میں 1967 میں مکہ روانہ کیا۔ملٹری سکریٹری کی یہ آخری مہم تھی کہ،امام محمد المہدیؑ کو تلاش کرنے اور ان کے پاس خلافت کے کاغذات پہنچائیں۔

نظام کا انتقال 1967 میں اس وقت ہوا جب ان کے ملٹری سکریٹری مدینہ میں تھے۔لیفٹیننٹ کرنل سید امیر الدین اپنے نظام کے لیے امام المہدی منتظرؑ کو تلاش کرنے میں ناکام رہے۔مایوس ہو کر حیدرآباد واپس آگئے۔لیفٹیننٹ کرنل سید امیر الدینؒ نے نوجوان مکرم جاہ کا مشاہدہ کیا۔

1967 میں نظام کے انتقال کے بعد، جاہ نے 1948 سے حیدرآباد کی بادشاہت کے خاتمے کے باوجود خود کو نظام VIII کا اعلان کیا۔تاہم، خلافت کے خطوط کے بغیر، وہ اپنے آپ کو خلیفہ کے ختم شدہ لقب کا وارث قرار دینے سے قاصر تھے جسے وہ اپنے نانا سے وراثت میں ملے تھے۔

لیفٹیننٹ کرنل سید امیر الدین نے مسلم دنیا کا سفر کرنے اور ملت کی اصلاح کے لیے کام کرنے کی دعوت محسوس کی، تاکہ اپنی زندگی میں سماجی اور سیاسی انحطاط کو دوسروں کی حالت زار بننے سے روکا جاسکے۔اس طرح، آپ نے محسوس کیا کہ ہندوستان چھوڑنا ضروری ہے لیکن مکرم جاہ نے ابھی تک خلافت کے منصب کے لیے ان سے رابطہ نہیں کیا تھا۔لہٰذا، حیدرآباد سے اپنے آنے والے سفر کی تیاری کے لیے، نظام مرحوم کے ملٹری سکریٹری نے آل رسول ﷺ کے ایک قابل ذکر اولاد سید لطیف الدین قادریؒ سے مشورہ کیا جو حیدرآباد میں رہتے تھے، اور وہ مسلم دنیا اور خلافت کی حالت زار پر بھی بہت گہری نظر رکھتے تھے۔

سید لطیف الدین قادریؒ نے نجف، کربلا، سمرہ اور بغداد کے سفر کے دوران بھی امام مہدیؑ کو تلاش کیا۔مزید برآں، انہوں نے مراکش کے بادشاہوں، ہاشمیوں، عظیم الشان شریفوں اور مکہ کے امیروں، حجاز کے بادشاہوں، اردن کے بادشاہوں، شام اور عراق کے بادشاہوں، فیض کے ادریسیوں، اسپین کے حمودیوں، اسپین کے حکمام کے ساتھ مشترکہ آبا اجداد۔لیبیا کے بادشاہ ادریس اول۔سے شجرہ خاندان سب سے ملتا ہے۔دونوں نے اس پر غور کیا کہ کیا کرنا ہے اور یہ طے پایا کہ نظام کا ملٹری سکریٹری اپنے بڑے بیٹے کی شادی سید لطیف الدین قادریؒ کی سب سے چھوٹی بہن سے کریں گے،اور بات چیت کے ایک حصے کے طور پر خلافت کی دستاویزات اس کے پاس امانت میں جمع

رہے گے۔دونوں نے فیصلہ کیا کہ ختم شدہ خلافت کے دستاویزات اس ازدواجی تعلقات کے بعد ملٹری سیکرٹری کی اولاد میں ایک امانت کے طور پر محفوظ رہیں گے جب تک کہ وہ مکرم جاہ یا منتظر مہدیؑ کو نہیں پہنچائے جاتے۔سید لطیف الدین قادریؒ کے ولد سید یوسف الدین صاحب رہبر دکن کے بانی و مدیر اعلیٰ تھے۔رہبر دکن دور آصفیہ میں ملی ترسیل کا ایک اہم ترین وسیلہ تھا۔جس نے نظام آصف جاہ کی شہرت وبلندی کو عالمی سطح پر پہنچایا۔بعد آزادی یہ اخبار رہنمائے دکن کے نام سید ور حاضر کا ترجمان ہے۔جس کی خدمات سید لطیف الدین قادریؒ اور سید وقار الدین قادری نے بطور مدیر اعلیٰ کیے۔خلافت کے دستاویزان کے مکان میں موجود تھے۔جس کاغذات کا مشاہدہ کرنے الام اعظم جامعہ الزہرؒ مسجد اقصیٰ کے تین مفتی اعظم اور امام الحرم مکۃ المکرّمہ کے علاوہ فلسطینی صدر یاسر عرفات جنہوں نے دو مرتبہ رہائش گاہ کا دورہ کیا۔2012 میں نظام کے ملٹری سکریٹری کا انتقال ہو گیا۔کہا جاتا ہے کہ ہر حج اکبر میں لیفٹیننٹ کرنل سید امیر الدینؒ منتظر مہدیؑ کی تلاش میں مکہ کا سفر کرتے تھے، جسے وہ ڈھونڈنے اور امانت پہنچانے کی امید رکھتے تھے۔اس اثنا میں انہوں نے 8 ہزار سے امریکی افراد کو مسلمان کیا۔ 2021 میں حیدرآباد میں جمع شدہ دستاویزات کے آخری سرپرست و روزنامہ رہنمائے دکن کے مدیر اعلیٰ سید وقار الدین قادریؒ کا انتقال ہو گیا۔ان کی وفات کے بعد، ان کے سامان کی تلاش کے دوران ان کی لواحقین کو ایک فائل ملی جس میں پرانے خطوط اور عربی میں کچھ دستاویز موجود تھی جس پر مکہ کے مختلف مفتیان کرام کے دستخط تھے۔

جہانگیر قیاس-حیدرآباد

نظم

دنیا کی رونقوں میں نہ کھو جا تو نوجوان
یہ یاد رکھ ہمیشہ تو فانی ہے یہ جہان

قرآن پڑھ کے دیکھ تو رب کی بڑی ہے شان
سارے جہانوں کا ہے فقط رب ہی حکمران

محبوب کبریا کی تو سنت پر چل کے دیکھ
دونوں جہاں میں ہوگا یقیناً تو کامران

کچھ بھی نہیں ہے تیرا یہاں جانتا ہے تو
رب کی امانتیں ہے تیرے جسم اور جان

دولت پہ اپنی بھول کے بھی کرنہ تو غرور
باقی نہیں رہے گی تری آن بان شان

رہ جائے گا دھرا یہاں سامان عیش سب
نیچے زمیں کے ہے ترا دو گز کا اک مکان

بندوں پہ مہربان جو بندہ رہے قیاسؔ
رہتا ہے اس پہ خالق کونین مہربان

شیخ شہباز ۔ پی۔ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، ایس۔وی یونیورسٹی، تروپتی، آندھراپردیش

پیغام آفاقی کا ناول ''دوست'' اور مسئلہ طلاق

بلاشبہ پیغام آفاقی کا شمار عہد حاضر کی نابغہ روزگار شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ پیغام آفاقی کا ناول ''دوست'' ان کے انتقال کے بعد 2018ء میں شائع ہوا جس کو ان کی شریک حیات رضیہ سلطانہ اور سلمان عبدالصمد نے ترتیب دیتے ہوئے چھپوایا ہے۔ مرتبین نے پیغام آفاقی کی تصنیف کو پیغام آفاقی کے قارئین کے نام منسوب کیا ہے۔

پیغام آفاقی ایک ایسے لکھاری ہیں جو اپنی کسی بھی تخلیق کی اشاعت میں عجلت پسندی کو رواں نہیں کرتے بلکہ اپنی تخلیق کو پائیدار بنانے اور اغلاط سے بری پیچیدگیوں سے اور بے ربطیوں سے دور رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے تین دہوں میں صرف ان کے تین ناول ہی منظر عام پر آئے ہیں۔ ایک ناول سے دوسرے ناول تک کا سفر جو طویل دکھائی دیتا ہے وہ محض ان کی خاموشی نہیں ہوتی بلکہ اس عرصے میں ان کے اندر کچھ نہ کچھ، کوئی نہ کوئی بولتے رہتا ہے اور جب اندر کی آواز خود کو ظاہر کرنے کے لیے بے چین و بے قرار ہوتی ہے تو اظہار کے لیے راہیں تلاش کرتی ہیں۔ جب کوئی راستہ دکھائی دیتا ہے تو ایک عمدہ تخلیق کی صورت میں وجود میں آتی ہے۔ اس تعلق سے پیغام آفاقی کے ہم عصر فکشن نگار غضنفر علی ان کی دیر پا خاموشی کی وجہ بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پیغام کے اس خاموشانہ رویہ سے دو تین باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ تخلیق کی اشاعت یا اسے منظر عام پر لانے کے سلسلے میں وہ عجلت پسند نہیں تھے۔ یعنی اس عمل میں وہ ٹھہراؤ کے قائل تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس راز سے واقف تھے کہ ٹھہراؤ تخلیق کو پائیدار، جاندار اور شاندار بناتا ہے۔ پیغام اس رمز سے بھی آشنا تھے کہ عجلت پسندی سے تخلیق کمزور اور بے وقعت بنا دیتی ہے۔'' (بحوالہ دوست، پیغام آفاقی، فلپ پیج اول، 2018)

پیغام آفاقی کے ہر ناول میں عورت ہی بنیادی موضوع رہی ہے۔ گویا ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' والی علامہ اقبال کی بات ان کے دل میں گھر کر گئی ہو۔ پیغام آفاقی دراصل اپنی تخلیقات کے ذریعے خواتین میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نسوانی معاشرہ اپنے بل بوتے پر ایک ایسا مقام حاصل کرلے جہاں عورتوں کے حقوق کی پامالی نہ ہو، ان کا استحصال نہ ہو، ان کی عزت کی جائے اور انھیں اپنا جائز مقام حاصل ہو۔

ناول ''دوست'' کے مطالعے سے جہاں کئی ایک معاشرتی و سماجی گرہیں کھلتے جاتے ہیں وہیں ایک سب سے اہم نکتہ کی بھی نشاندہی ہوتی ہے جس سے پیغام آفاقی کی جرأت تخلیقیت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انسان جس

معاشرے میں پرورش پاتا ہے اس معاشرے کی چند باتیں اس کے ذہن میں بندھ جاتی ہیں۔ ان باتوں پر اس کا پختہ بھروسہ اور یقین ہوتا ہے کہ وہ باتیں اور عمل اس کے لیے ایمان کا درجہ رکھتی ہیں۔ خواتین چوں کہ زیادہ حساس ہوتی ہیں لہٰذا معاشرے سے جڑی باتوں کا اثر ان پر کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اگر معاملہ مذہب کا ہو تو انسان اس معاملے میں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ مسلم معاشرے میں ''طلاق'' کو نا پسندیدہ عمل تصور کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ کسی بھی صورت میں واقع ہو۔ ''نینا'' اپنے شوہر کے برتاؤ سے تنگ آچکی ہے۔ وہ کسی بھی طرح اسے اُذیت سے نجات چاہتی ہے چاہے ''طلاق'' کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔

طلاق کا مسئلہ ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ یہ وہ جائز عمل ہے جو کسی کو بھی پسند نہیں۔ نینا چاہتی تھی کہ شوہر کے تین بار طلاق کہنے سے طلاق ہو جاتی ہے جس کے بعد عورت شوہر کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ چاہے طلاق ایک ہی مرتبہ ایک ہی نشست میں ہی کیوں نہ دی جائے۔ یہ اور بات ہے کہ طلاق کا یہ طریقہ کسی بھی طرح سے موزوں نہیں۔ جب عورت کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے شوہر نے اس سے تین بار طلاق دی ہے اور اچانک فطری طور پر شوہر سے جسمانی تعلقات اُذیت ناک ہو جاتے ہیں اور اس حرکت سے اسے کراہت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی مطلاقہ بیوی کے ساتھ اپنے جسمانی تعلقات کو رواں رکھتا ہے تو محض وہ عورت پر ظلم ہی نہیں بلکہ وہ خود بھی بدکاری کا مرکز ہو رہا ہے اور گناہِ عظیم کر رہا ہے جو ایک مہذب سماج میں نہ پسندیدہ عمل کہلاتا ہے۔ اس نازک پہلو پر پیغام آفاقی نے نظر ڈالی ہے جہاں نینا اپنے شوہر کے استحصال کا شکار ہو رہی ہے چوں کہ شرعی طور پر اس کا رشتہ ازدواج باقی نہیں رہتا۔ اس بات سے کمال رحمانی بھی واقف تھا۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''کمال رحمانی بار بار مجھے طلاق دیتے تھے۔ تین تین بار کہا تھا کہ میں نے تمہیں طلاق دی اور مجھ سے کہتے تھے کہ اب تم میرے لیے حرام ہو گئی ہو۔ پھر بھی میں تمہارے ساتھ زبردستی زنا کروں گا اور دیکھتا ہوں کہ تمہارا باپ کیا کر لیتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ایسا کر کے تمہیں رنڈی بناؤں گا۔'' (بحوالہ دوست، پیغام آفاقی، 2018ء، ص۔ 157)

مرد اساس اس سماج میں ہر طرح کا گناہ مردوں کو مرغوب ہے چوں کہ وہ گناہ تو کرتے ہیں لیکن گناہ کا اقرار نہیں کرتے اور خود کو مہذب، شریف اور دانشور سمجھنے لگتے ہیں اور اس گناہِ ذلت آمیز دلدل میں خود غرق ہوتی ہے تو وہ صرف عورت ہی ہوتی ہے۔ نینا جیسی کئی عورتیں ہوں گی جو اس اُذیت کا شکار ہوئی ہوں گی۔ وہ کس طرح اس کراہت ناک ماحول میں زندگی گذار رہی ہے وہی جانتی ہیں اور کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''وہ بچپن ہی سے زِنا کے بارے میں سنتی آئی تھی اور طلاق کے قانون کے بارے میں بھی سنتی آئی تھی۔ ایک بار ایک آدمی نے غصے میں آکر اپنی بیوی کو کہہ دیا تھا کہ وہ اس کو طلاق دے رہا ہے اور تین بار طلاق کا لفظ بول دیا تھا وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ فوراً شوہر کو خیال آیا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کر دی۔ اس کا ذہن اُلجھ گیا۔ جب اس نے دوسروں کو بتایا تو کسی نے بیوی سے کہہ

دیا کہ وہ اب اس کے شوہر کے لیے حرام ہو چکی ہے۔شوہر نے بہت کہا کہ یہ سب اس نے غصے میں کہا تھا لیکن بیوی کے جی نے یہ قبول نہیں کیا کہ وہ شوہر کو ایسا ہاتھ لگانے دے۔اس کے بعد وہ کسی مولوی سے مشورہ لینے لگی تو سب نے کہا کہ طلاق ہو چکی اور اب شوہر اسے واپس نہیں لے سکتا اور اگر وہ بیوی کو واپس لینا چاہتا ہے تو پہلے بیوی کا کسی اور سے نکاح ہوگا اور وہ بیوی کے ساتھ مباشرت کرے گا اور پھر طلاق دے گا تبھی وہ اس سے دوبارہ نکاح پڑھ سکتا ہے۔"(بحوا لہ دوست، پیغام آفاقی، 2018،ص۔40)

اس طرح اس ناول میں کئی ایک مذہبی و معاشرتی پہلو نظر آتے ہیں۔پیغام آفاقی نے طلاق کے موضوع جو عموماً پچھلے چند سالوں سے اس ملک میں برننگ ایشو (Burning Issue) بن چکا ہے جس سے اسلام کی شبیہ پر کافی اثر پڑا ہے۔آفاقی نے اس اساسی پہلو میں اسلام کے مسلمہ اُصول کو جس طرح پیش کیا ہے وہ اسلام کے عائلی نظام سے بالکل برعکس بلکہ منافیٔ اسلام ہے۔ساتھ ہی ساتھ مسئلہ طلاق کی ایک مکروہ شکل سامنے آتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

"مولوی کے پاس گئی تھی اور حقائق کو کھول کھول کر بیان کیا۔اس کے باوجود مولوی اس کی طلاق کو قبول نہیں کرتا.......اس نے اتنی بڑی بے وقعتی اور توہین کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچا تھا......خدا اس کی مدد نہیں کرتا۔یہ خدا کے ذریعے لیا جانے والا کیسا امتحان ہے کہ اس کا زِنا بالجبر ہوتا ہے اور خدا کا قانون کچھ نہیں کر سکتا.......ایسا کوئی قانون کیوں نہیں جو اکیلے میں دیئے گئے طلاق کو منوا سکے۔"(بحوالہ مضمون دوست کی کہانی از سلمان عبدالصمد مشمولہ ناول دوست، 2018،ص۔177)

پیغام آفاقی نے ناول "دوست" میں مسئلہ طلاق پر ذرا بھی غور نہیں کیا بلکہ ایک ایسا منظر نامہ پیش کر دیا جو کہ ان کے اسلامی نظامِ طلاق سے نا آشنائی پر دال ہے۔مسئلہ طلاق کو اس طرح پیش کرنے میں پیغام آفاقی کا منشا اسلام کو نشانہ تنقید بنایا قطعاً نہیں تھا بلکہ تانیثیت کی علمبرداری میں اس حد تک متفرق تھے کہ جہاں بھی انھیں عورتوں کی محرومی کا احساس ہو جائے۔وہاں سے اپنا فلسفیانہ نکتہ اُچک لیتے ہیں۔اپنے فلسفیانہ نکتے پر نظر ڈالتے ہوئے انھوں نے جس طرح مسئلہ طلاق کو پیش کیا ہے اس میں عورت کے مساویانہ حقوق نظر آتے ہیں جو ان کا مقصود تھا۔حالاں کہ اسلامی نظامِ طلاق ایسا نہیں ہے۔

اس ناول کے مطالعے سے ایک ایسی نئی تہذیب کی جھلک واضح ہوتی ہے جس میں مکمل طور پر مسئلہ رشتہ ازدواج سے فرار کی کیفیت موجود ہے نہ صرف فراریت کی کیفیت مرد کی ذہنیت میں ہے بلکہ اس ناول کا نسوانی مرکزی کردار بھی اسی فراریت پر گامزن ہے۔اس طرح اس ناول سے معاشرتی ومذہبی اقدار پر کاری ضرب لگتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر نادر المسدوسی۔صدر بزم علم وادب،حیدرآباد

غزل

شعر میرا پنکھڑیوں جیسے لبوں کو چھولیا
جب ردیفوں کی مہک نے قافیوں کو چھولیا

لمس کی خوشبو ہمیں آنے لگی ہر شعر سے
میرے فن کا عکس تیری عظمتوں کو چھولیا

تیری پلکوں پر ٹھہر کر مجھ کو کچھ ایسا لگا
جیسے میری زندگی نے رفعتوں کو چھولیا

دل مرا ویران بستر کی طرح بے نور تھا
اس لئے تنہائیوں نے سلوٹوں کو چھولیا

میں نے دروازہ ابھی کھولا نہیں تھا ٹھیک سے
میرے کانوں نے کسی کی آہٹوں کو چھولیا

موم کی طرح پگھل جانا مرا اچھا ہوا
جھوٹ کا لاوا مری سچائیوں کو چھولیا

اس لئے میری غزل میں استعارے ہیں بہت
شاعری کا کرب میری تلخیوں کو چھولیا

جن لبوں سے بہ رہی تھی اوس کے جیسی شراب
''تتلیوں نے بھی لپک کر ان لبوں کو چھولیا''

دل ہمیشہ کی طرح نادرؔ کا اپنے چپ رہا
یہ دھڑکتی دھڑکنوں دھڑکنوں کو چھولیا

فہیم خیر محمد یٰسین ھابیل
ڈیلاس امریکہ

غزل

عاشقوں کی گلی میں نظر تم جھکا کے گزرنا
پاک دامن کو اپنے ذرا تم بچا کے گزرنا

دل کا کیا بھروسہ کب کس پہ آجائے
چہرے کو دنیا کی نظر سے تم چھپا کے گزرنا

زمانہ کہیں نہ کہہ دے تم کو ان کا قاتل
مہندی اپنے ہاتھوں میں نہ تم لگا کے گزرنا

کوئی بادل سے چرا کے لایا ہے ساگر
نگاہوں میں اپنے کاجل تم بسا کے گزرنا

ہابیلؔ کو نہیں ہوا میسر چاہت کا خمار
اسے اب جام الفت تم پلا کے گزرنا

مولانا ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی کی دو کتابیں

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دو عدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

مبصر: **اسامہ ارشاد معروفی قاسمی**۔ پورہ معروف کرتھی جعفر پور ضلع مئو، یوپی

ہندوستان کے سیاسی و روحانی رہنما اور آزادی کی تحریک کے اہم ترین کردار موہن داس کرم چند گاندھی (گاندھی جی) کی پیدائش ۲/ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو گجرات کے پور بندر کاٹھیاواڑ میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم پور بندر میں حاصل کی، ۱۸۷۶ء میں اپنے والد کے ساتھ راج کوٹ چلے گئے اور وہاں ۱۸۸۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد بغرض تعلیم لندن گئے اور وہاں سے ۱۸۹۱ء میں بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی، اس کے علاوہ گاندھی جی نے تمام عالم گیر مذاہب کی اہم کتابوں کا تفصیلی مطالعہ بھی کیا، ہر موضوع پر گاندھی جی کو ایک خاص دسترس حاصل تھی۔

ہندوستان میں گاندھی جی عدم تشدد کی بلند آواز تھے، انھوں نے اپنی تحریکوں اور تحریروں کے ذریعہ عدم تشدد کے تصور کو عام کیا جس سے کارکنان اور عام شہری یکساں طور پر متاثر ہوئے۔ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ عدم تشدد ایک بڑی طاقت ہے اور یہ انسان کا بنایا ہوا ایک طاقتور ہتھیار ہے۔ گاندھی جی کے تمام آدرش واصول خواہ وہ اہنسا ہو، ستیہ گرہ ہو یا بھائی چارہ، نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مقبول ہوئے اور عالمی پیمانے پر مفکروں، قلم کاروں اور فنکاروں نے انھیں سراہا بھی۔ مہاتما گاندھی ایک عہد ساز بلکہ تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے اپنے قول و فعل، مضبوط عزائم اور اصولوں کی پابندی کا مظاہرہ کر کے ہندوستان کی تقدیر بدلنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے کئی دوسرے ملکوں کو بھی غیروں کی غلامی سے آزاد ہونے کی راہ دکھائی۔ گاندھی جی کے اہم کارناموں میں قومی اتحاد، فرقہ وارانہ خیر سگالی، عدم تشدد اور اہنسا کا فلسفہ بڑے اہمیت کے حامل ہیں۔

گاندھی جینتی (Gandhi Jayanti) ہر سال ۲/ اکتوبر کو موہن داس کرم چند گاندھی کے یوم پیدائش کے موقع پر منائی جاتی ہے، اس دن ملک میں ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کر کے قومی تعطیل منائی جاتی ہے۔ اور اس دن کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی عدم تشدد کا عالمی دن قرار دیا ہے، اس دن امن، رواداری اور عدم تشدد کی ثقافت اور اس کے تصور کی عالم گیر اہمیت کو واضح کیا جاتا ہے۔ نیز سیمیناروں کے ذریعہ گاندھی جی کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

زیر تعارف کتاب ''گاندھی جی ادباء اور شعراء کی نظر میں'' دراصل ۲/ اکتوبر ۲۰۱۹ء گاندھی جی کی ۱۵۰ رویں یوم پیدائش کے موقع پر شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام اردو گھر مغل پورہ میں یک روزہ قومی سیمینار بعنوان ''گاندھی اردو ادیبوں اور شاعروں کی نظر میں'' پیش

کیے گئے، مقالات کا مجموعہ ہے جس کے مرتب ماہنامہ صدائے شبلی کے ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد ہلال اعظمی ہیں۔ کتاب میں پروفیسر مجید بیدار، پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محمد محمود صدیقی اور ڈاکٹر سمیہ تمکین سمیت ۲۵ر دانشوروں اور ادیبوں کے مقالات شامل ہیں، ان کے علاوہ آنند نرائن ملا، اقبال سہیل، شمیم کرہانی، یحییٰ اعظمی، منظر بھوپالی اور صوفی خیر الدین شاہ کی نظمیں بھی شامل ہیں جو گاندھی جی کی شخصیت اور ان کے نظریات کو واضح کرتی ہیں اگر مقالات کی بات کی جائے تو سبھی مقالے بہت ہی اہم اور معلومات افزا ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب کے مطالعے سے گاندھی جی کے سیاسی و سماجی افکار و نظریات، تحریک آزادی کے کردار، ان کی لسانی پالیسی، نظریۂ تعلیم، تعلیمی افکار اور دور حاضر میں ان کی معنویت، ادب اطفال کے حوالے سے ان کی شخصیت، الغرض گاندھی جی کی تمام جہتیں روشن ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قارئین اس کتاب کے مطالعہ سے بہت کچھ سیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں ''اپنی بات'' کے عنوان سے مرتب ڈاکٹر محمد ہلال اعظمی کی ۵۱ر صفحات پر مشتمل طویل و تفصیلی تحریر بھی شامل ہے، جس میں موصوف نے ''شبلی انٹر نیشنل ایجوکیشنل'' حیدرآباد کا تعارف اور اس کی سرگرمیوں کی روداد کے علاوہ مہاتما گاندھی کی شخصیت و خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ کتاب ۲۸۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۴۰۰ر روپے، اشاعت ۲۰۲۰ء۔ ناشر: شبلی انٹرنیشنل ٹرسٹ حیدرآباد۔ رابطہ نمبر: 9392533661

☆☆☆

تعلیم کسی بھی قوم کی سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے کافی اہم ہوتی ہے۔ تعلیم دینی ہو یا عصری دونوں ہی انسان کو کام کرنے اور زندگی میں سبقت حاصل کرنے کے لیے بہتر سہولیات فراہم کرتی ہے، یہ ایک صحیح راستہ دکھا کر انسان کو کامیابی کی طرف لے جاتی ہے اور یوں وہ اعلیٰ خود اعتمادی کے ساتھ خوشگوار زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے اگر ہم کسی کو کچھ پیسہ دیں گے تو وہ اس سے چند دن خوشگوار زندگی بسر کرسکتا ہے؛ لیکن ہم اگر کسی کو تعلیم سے آراستہ کردیں تو اس کی پوری زندگی سنور جائے گی، یہ ہے تعلیم کی قوت۔

زیر تعارف کتاب ''قوت تعلیم: افکار و نظریات'' ان مقالات کا مجموعہ ہے جو دینی و عصری تعلیم کی اہمیت و افادیت اور عہد حاضر میں تعلیم کے چیلنجز کے پیش نظر شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل حیدرآباد کے زیر اہتمام ہونے والی کانفرنس بعنوان ''قوت تعلیم انٹرنیشنل کانفرنس'' میں پیش کیے گئے، اس کتاب کے مرتب ٹرسٹ کے چیئرمین اور کئی اہم کتابوں کے مصنف و مرتب مولانا ڈاکٹر محمد ہلال اعظمی ہیں۔ موصوف نے بہت ہی بہتر اور مناسب انداز میں کتاب کو مرتب کیا ہے۔ آغاز میں مرتب موصوف کا ۲۲ر صفحات پر مشتمل مقدمہ شامل ہے جس میں انھوں نے دینی و عصری تعلیم کی قوت و افادیت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ مزید دینی و عصری تعلیم کو ایک ساتھ لے کر چلنے اور تطبیق کی صورت نکالنے پر زور دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ اگر مذہبی اور عصری دونوں دھاروں کو یکجا کردیا جائے، کچھ عصری میں اہم کتابیں مذہب کی داخل کردیں جیسے قرآن اور مذہبی میں کچھ عصری اہم کتابیں داخل کردیں جیسے علم سائنس اور ریاضی اور ان میں توازن پیدا کرتے ہوئے کچھ ایسی راہیں نکالی جائیں کہ جس میں ایک شخص گریجویٹ بھی ہو اور عالم بھی ہو۔ جیسا

کہ آزادی سے قبل اس طرح کا نظام تھا۔" (ص:۲۳)

مذکورہ کتاب (قوت تعلیم افکار و نظریات) میں مختلف فکر و نظر رکھنے والے باصلاحیت عالموں، پروفیسروں، ڈاکٹروں اور ریسرچ اسکالروں کے ۵۰/ مقالات شامل ہیں، جن میں ۹/ مقالات ایسے ہیں جن کو مدارس سے فارغ التحصیل علما نے لکھے، ان مقالات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث میں تعلیم کا کیا مقام ہے اور مدارس میں کیا تعلیم دی جاتی ہے، علما و اکابرین کے تعلیمی نظریات کیا ہیں۔ مدارس کے نصاب یا طریقۂ تعلیم میں اصلاح ضروری ہے یا نہیں، ان سارے سوالوں کے جوابات بھی مل جاتے ہیں۔ اسی طرح کتاب میں ۱۹/ مقالات ایسے ہیں جن کو ہندوستان بھر کے پروفیسروں اور ڈاکٹروں نے لکھا ہے۔ ان مقالات میں تعلیم کی قوت کو مختلف افکار و خیالات بالخصوص اردو زبان و ادب کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ نیز مقالہ نگاروں نے عہد حاضر میں عصری تعلیم کتنی ضروری ہے، اس کے چیلنجز کیا ہیں۔ بالخصوص طلبۂ مدارس کس طرح سے ان کا سامنا کرسکتے ہیں ان ساری مشکلات کا حل بھی پیش کیا ہے۔

کتاب کے بقیہ مقالات مختلف یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالروں کے قلم سے ہیں، جن کے مطالعہ سے اسکالروں کے تعلیمی نظریات بہت ہی واضح نظر آتے ہیں۔ نیز ان کی خود اعتمادی اور بالغ نظری صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔

کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر اور مفید ہے، بالخصوص اس کا مطالعہ اساتذہ و طلبہ اور تعلیم سے جڑے ہر افراد کے لیے بہت ہی کارآمد ہوگا، ان شاء اللہ۔ کتاب ۴۱۶/ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۴۹۹/ روپے، اشاعت ۲۰۱۹ء۔ ناشر: شبلی انٹرنیشنل ٹرسٹ حیدرآباد۔

علمی سرمائے کی منتقلی کے لئے اقوام ترجمے کی اسیر۔ اُردو ترجمہ نگاری میں عصری تکنالوجی کے استعمال کی وکالت

شعبۂ اُردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کی جانب سے منعقدہ دوروزہ قومی سمینار سے، مہمان مقررین کا خطاب

حیدرآباد۔ (راست) علمی سرمائے کی منتقلی کے لئے اقوام ترجمے کی اسیر ہیں اور اُردو ترجمہ نگاری میں عصری تکنالوجی کے استعمال کو یقینی بنایا جائے تاکہ وقت کی کمی سے ہونے والے مسائل سے نمٹا جاسکے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'عصرِ حاضر میں اُردو ترجمہ نگاری: اہمیت، مسائل اور امکانات' کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوے کیا، جس کا انعقاد شعبہ ء اُردو، اسکول آف ہیومانٹیز یونیورسٹی آف حیدرآباد کی رپوتاژ: ڈاکٹر محمد آصف علی۔ روبی چینل حیدرآباد جانب سے بہ تعاون انسٹی ٹیوٹ آف اِمینینس کیا گیا تھا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر نسیم الدین فریس سابق صدر شعبہ ء اُردو مانو نے کی جبکہ پروفیسر ایس اے شکور سابق صدر شعبہ ء اُردو عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر قاسم علی خان سابق صدر شعبہ ء اُردو ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی، پروفیسر شوکت حیات سابق صدر شعبہ ء اُردو ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی اور پروفیسر ارجمند آراء شعبہ ء اُردو دہلی یونیورسٹی نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور خطاب کیا۔

پروفیسر سید فضل اللہ مکرم پروفیسر شعبہ ء اُردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے اس دوروزہ سمینار کی بحیثیت سرپرست نگرانی کی، انہوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ شعبہ ء اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کی جانب سے اس طرح کی پہل وقتاً فوقتاً ہوتی رہیگی اور اس طرح کی علمی سرگرمیوں سے مختلف موضوعات پر تحقیقی دریچے کھلتے ہیں اور نئی راہیں فراہم ہوتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ترجمہ اہم شعبہ ہے جس سے اُردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد کاشف اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء اُردو نے سمینار کی رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ 40 سے زائد مقالہ نگاروں نے اس دوروزہ قومی سمینار میں اپنے تحقیقی مقالے پیش کئے ہیں۔ڈاکٹر ناظم علی سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ نے سمینار کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔وفیسر ایس اے شکور سابق صدر شعبہء اُردو عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر قاسم علی خان سابق صدر شعبہء اُردو ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی، پروفیسر شوکت حیات سابق صدر شعبہء اُردو ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی اور پروفیسر ارجمند آراء شعبہء اُردو دہلی یونیورسٹی نے شعبہ ءاردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کو مبارکباد پیش کی کہ اس طرح کی علمی سرگرمی میں جنوب سے شمال تک کی علمی شخصیتوں کو مدعو کرتے ہوے ایک نایاب موقع فراہم کیا گیا۔ پروفیسر نسیم الدین فریس سابق صدر شعبہء اُردو مانو نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ترجمے کا عمل زبان کے وجود ہی سے جاری ہے جس کے ذریعہ علمی، سماجی، مذہبی و دیگر سرمایوں کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا رہا ہے اور اب بھی یہ عمل جاری ہے۔انہوں نے قومی سمینار کے انعقاد پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔اختتامی اجلاس کی نظامت جوائنٹ کنوینر سمینار ڈاکٹر اے آر منظر (شعبہء اُردو یونیورسٹی آف حیدرآباد) نے کی ۔اس دوروزہ سمینار کے پہلے روز ڈاکٹر ذاکر حسین لکچر کامپلیکس میں واقع آڈیٹوریم میں افتتاحی اجلاس منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر رحت یوسف زئی سابق صدر شعبہء اُردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے کی جبکہ پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبہء اُردو عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہء اُردو عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر سجاد حسین سابق صدر شعبہء اُردو مدراس یونیورسٹی اور پروفیسر شہاب عنایت ملک (جموں یونیورسٹی) نے مہمانانِ خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوے خطاب کیا۔ پروفیسر آر ایس سر راجو پرووائس چانسلر یونیورسٹی آف حیدرآباد نے مہمانِ اعزازی کے طور پر شرکت کرتے ہوے افتتاحی خطبہ دیا۔ پروفیسر حبیب نثار، صدر شعبہء اُردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے مہمانوں اور شرکاء کا خیر مقدم کیا جبکہ افتتاحی اجلاس کی نگرانی بھی بہ حیثیت سرپرست سمینار پروفیسر سید فضل اللہ مکرم ہی نے کی۔ پروفیسر ارجمند آراء (یونیورسٹی آف دہلی) نے کلیدی خطبہ دیا جس کے دوران انہوں نے ترجمے کے دوران عملی میدان میں پیش آنے والی مشکلات اور اُن کے حل پر تفصیلی روشنی ڈالی، انہوں نے کہا کہ کامیاب ترجمہ وہی ہے جس میں محنت، مشقت اور ریاضت کے ساتھ اصل کی روح بھی منتقل ہوجائے۔افتتاحی اجلاس کی نظامت ریسرچ اسکالر محمد خوشتر نے کی اور جوائنٹ کنوینر سمینار ڈاکٹر نشاط نے ہدیہء تشکر پیش کیا جبکہ مہمانان کو تہنیت کو طور پر مومنٹوز بھی پیش کئے گئے۔اس سمینار کے لئے شعبہ ء اُردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کی جانب سے ملک بھر سے تقریباً 100 مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا، افتتاحی اور اختتامی اجلاس کے علاوہ جملہ آٹھ اجلاس منعقد ہوے جس میں ملک کی کئی یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے مختلف موضوعات پر اپنے مقالے پیش کئے۔

قرآن مجید ہدایت کا سرچشمہ اور دنیا وآخرت میں کامیابی کا ضامن

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام جلسہ تکمیل حفظ قرآن ودستار بندی کا انعقاد

حیدرآباد (صدائے شبلی نیوز) گزشتہ روز مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم وادیٔ عمر، شاہین نگر حیدرآباد میں شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیرانتظام جلسہ تکمیل حفظ قرآن ودستار بندی کا انعقاد کیا گیا۔ مذکور تقریب کی صدارت استاذ الاساتذہ حضرت مولانا نورالعین صاحب قاسمی استاذِ حدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد نے کی۔ انہوں نے صدارتی خطاب میں کہا کہ حفظ قرآن سعادت عظمی ہے اس کی حفاظت میں کبھی کمی نہیں کرنی چاہئے اور حافظ قرآن کے ساتھ اگر حفاظ حضرات عالم دین بننے کا ارادہ کرلیں تو سونے پر سہاگہ ہوگا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے مولانا زعیم الدن حسامی معتمد سراج العلماء اکیڈمی حیدرآباد، الحاج رئیس اقبال انجینئر صاحب صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی حیدرآباد، الحاج جناب محمد ریاض اللہ خان شیر علی سہارا ویلفیئر سوسائٹی حیدرآباد نے شرکت کی۔ حسامی صاحب نے قرآن اور عظمت قرآن پر پرمغز خطاب کیا۔ انہوں نے واقعات اور مثالوں کے ذریعہ سامعین اور حفاظ کرام کے سامنے متاثر کن خطاب کیا۔

مہمان اعزازی کی حیثیت سے مفتی زاہد ناصری، مولانا حافظ فہیم الدین صاحب، حافظ وقاری زبیر احمد صدیقی، مولانا منصور احمد قاسمی، مولانا شریف اللہ خان قاسمی۔ مولانا محمد عاقل خان قاسمی، مولانا حافظ محمد اکرم قاسمی صاحب نے جلسہ کو رونق بخشی۔ مولانا حافظ فہیم الدین صاحب ناظم مدرسہ ابی ابن کعب حیات نگر حیدرآباد نے مدرسہ کے دونوں حفاظ کرام حافظ محمد محمود، حافظ محمد فوزان کے قرآن مجید کی تکمیل فرمائی۔ مدرسہ ہذا کہ ناظم ایڈیٹر صدائے شبلی حیدرآباد اور چیئرمین ٹرسٹ نے نظامت کرتے ہوئے اس جلسہ کا آغاز کرنے کے لیے حافظ فوزان کو تلاوت قرآن مجید کی دعوت دی اور تین شعراء عظام حافظ وقاری زاہد ہریانوی، تشکیل رزاقی اور جہاں گیر قیاس نے اپنی نعتوں اور نظموں کے ذریعہ محفل پر سماء باندھ دیا۔

ٹرسٹیز، معاونین ومدرسین ڈاکٹر عبدالقدوس، مولانا مساعد ہلال احیائی، محمد مجاہد ہلال اعظمی، حافظ وقاری محمد شاکر قاسمی، مولانا حافظ وقار حسامی، مولانا راشد فضل قاسمی، حافظ شمس تبریز وغیرہ نے ادارہ اور جلسہ کے انتظام وانصرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ڈاکٹر عبدالقدوس ٹرسٹی شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ نے ٹرسٹ کا تعارف اغراض ومقاصد، ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد اور مدرس اسلامیہ نجم العلوم کے ارتقائی مراحل اور موجودہ کیفیت پر بصیرت افروز خطاب کیا۔

ناظم مدرسہ مولانا حافظ وقاری ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی نے مہمانوں، سامعین، حاضرین، مدرسین اور تمام معاونین کا شکریہ ادا کیا اور ادارہ کے آغاز وارتقاء پر گفتگو کی۔

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد کا خصوصی شمارہ برکت

نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ کی یاد میں

حیدرآباد: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ صدائے شبلی اپنے مختصر مگر مفید سفر میں چار خصوصی شمارے شائع کئے۔ خصوصی شبلی نمبر، خصوصی جامی نمبر، خصوصی دوسوسالہ صحافت نمبر، خصوصی برکت، جو نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر کی یاد میں ہے۔ اس شمارے کا رسمِ اجراء حضرت عبد الرحمٰن جامی مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم وادیٔ عمر شاہین نگر میں بدست الحاج رئیس اقبال انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی حیدرآباد ہوا۔

رسم رونمائی کے موقع پر ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد کے ایڈیٹر ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی نے شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کا تعارف کراتے ہوئے اس کی ایک اہم کڑی ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد کو شمار کیا۔ ماہنامہ کی ابتداء آج سے ٹھیک پانچ سال قبل نومولود یونیورسٹی ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول آندھراپردیش میں اس وقت کے وائس چانسلر استاذ الاساتذہ پروفیسر مظفر علی شہ میری کے ہاتھوں سے ہوئی۔ آج یہ ماہنامہ پورے ہندوستان میں اور سوشل میڈیا کے ذریعہ تقریباً آدھی دنیا میں شناخت بنا چکا ہے اور اسے اہل علم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ادارہ اپنے تمام معاونین اور قلمکاروں کا شکریہ ادا کرتا ہے اور حسب سابق تعاون کا خواہش مند ہے۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC

Consultation Time
Morning: 9:00 am to 2:00 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

مسجدِ الٰہی کی تعمیر کے لئے تعاون کی اپیل

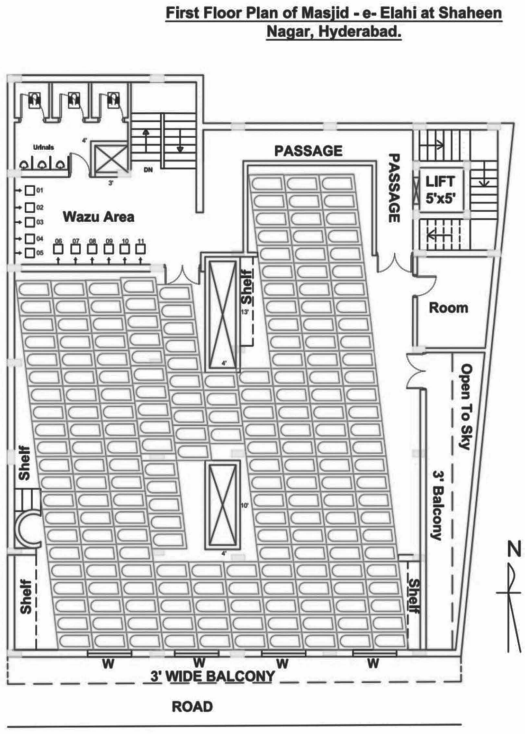

مسجدِ الٰہی زیرِ انتظام شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیرٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کا تعمیری کام شروع ہورہا ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ ایک مخیّرہ خاتون نے 126 گز اراضی ٹرسٹ ہذا کو مسجد کے لئے وقف کردی ہے، اللہ تعالیٰ مخیّرہ کو دونوں جہاں میں بہترین بدلہ دے، آمین۔ مسجدِ الٰہی کی زمین مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم وادیٔ عمر شاہین نگر حیدرآباد کا (اقامتی وغیر اقامتی) ادارہ ہے، جو شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیرِ انتظام 2017 سے خدمات انجام دے رہا ہے، بالکل اسی سے متصل ہے۔ مدرسہ ہذا اور بستی کے لئے مسجد ناگزیر ہے، اس وجہ سے آپ تمام حضرات سے گزارش کی جاتی ہے کہ مسجد ہذا کی تعمیری کام میں ایک مصلیٰ =/1200 روپئے ایک ایک اسکوائر فٹ =/830 روپئے نقد یا اشیاء کے ذریعہ معائنہ کرکے حصہ لے کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔

جزاک اللّٰہ أحسن الجزاء.

Bank Name : IDBI **A/c Number :** 1327104000065876
A/c Name : SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFSC Code : IBKL0001327. Branch: Charminar
Google Pay : 8317692718, WhatsApp : 9392533661

العارض: حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہٰذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد